الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

ماہ نامہ

اشرفیہ

مبارک پور

ستمبر 2026

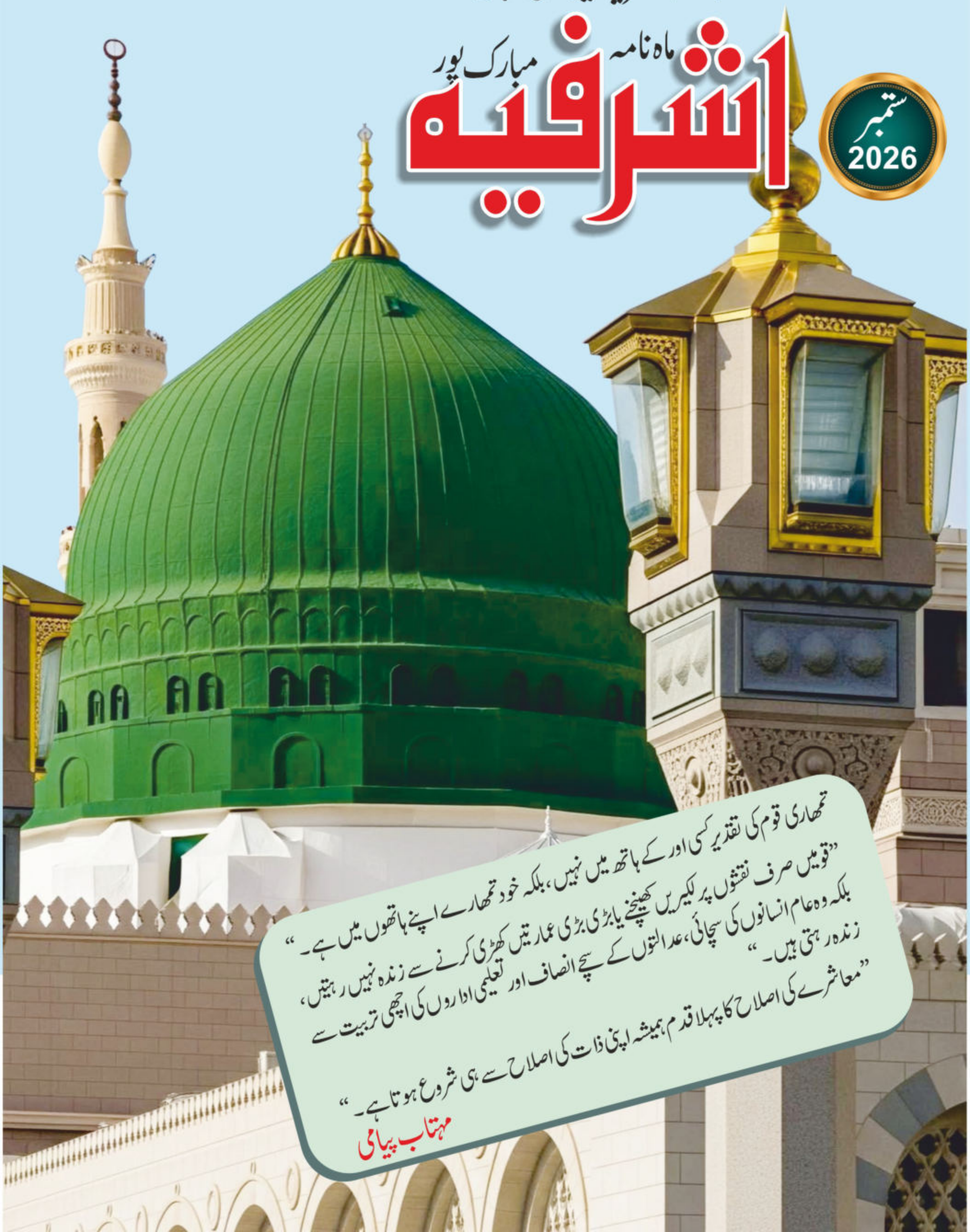

"تمھاری قوم کی تقدیر کسی اور کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ خود تمھارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔"

"قومیں صرف نقشوں پر لکیریں کھینچنے یا بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنے سے زندہ نہیں رہتیں، بلکہ وہ عام انسانوں کی سچائی، عدالتوں کے سچے انصاف اور تعلیمی اداروں کی اچھی تربیت سے زندہ رہتی ہیں۔"

"معاشرے کی اصلاح کا پہلا قدم ہمیشہ اپنی ذات کی اصلاح سے ہی شروع ہوتا ہے۔"

مہتاب پیامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیاد گار: حضور حافظ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہٗ، بانی الجامعۃ الاشرفیہ

زیر سرپرستی: عزیز ملت حضرت علامہ شاہ **عبد الحفیظ عزیزی**، سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

ماہنامہ

اشرفیہ

مبارک پور

جلد نمبر: 51 شمارہ نمبر: 9 | ستمبر 2026ء | ربیع الاول - ربیع الثانی 1448ھ

مجلس ادارت

مہتاب پیامی

منیجر

محمد محبوب عزیزی

مجلس مشاورت

مولانا محمد احمد مصباحی

مفتی محمد نظام الدین رضوی

مولانا محمد ادریس بستوی

مفتی بدر عالم مصباحی

مولانا محمد عبد المبین نعمانی

زر تعاون بھیجنے کے لیے اسے اسکین کریں۔

Account Detail:
Ashrafia Monthly
A/c No. 3672174629
Central Bank of India
Branch Mubarakpur, IFSC-CBIN0284532

رقم جمع کرنے کے بعد آفس کے نمبر پر فون کریں یا بذریعہ ڈاک مطلع کریں۔ (منیجر)

مراسلت کا پتہ

دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ یوپی۔ ۲۷۶۴۰۴

Office The Ashrafia Monthly,
Mubarakpur, Distt. Azamgarh, U.P.-276404

(رابطہ نمبر منیجر) +91 9935162520

زر تعاون

قیمت عام شمارہ	₹ 30
زر سالانہ (سادہ ڈاک)	₹ 300
زر سالانہ (رجسٹری)	₹ 600

زر تعاون

سری لنکا، بنگلہ دیش، پاکستان (سالانہ)	₹ 750
دیگر بیرونی ممالک۔ ڈالر	$ 25
دیگر بیرونی ممالک۔ پونڈ	£ 20

ماہنامہ اشرفیہ الجامعۃ الاشرفیہ کی ویب سائٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں

http://www.aljamiatulashrafia.org
ashrafiamonthly@gmail.com
payamee@gmail.com

مولانا محمد ادریس بستوی نے [illegible] سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ سے شائع کیا

مشمولات

اداریہ		ہم ایک بیمار قوم ہیں	مہتاب پیامی	5
قرآنیات	تفہیم قرآن	قرآن مجید میں جلوۂ جمالِ رسول	مولانا محمد حبیب اللہ بیگ ازہری	10
فقہیات	آپ کے مسائل	کیا فرماتے ہیں......	مفتی محمد نظام الدین رضوی	15
تحقیقات	شواہد و نتائج	معیار قطعیت و ظنیت اور اختلاف متکلّمین و فقہا	سید حدیر الحسن شاہ	17
نظریات	فکر امروز	صحافت کا زوال یا ترجیحات کا بیان	شمس آغاز	19
اسلامیات	شعائر	احکام طلاق میں عرف دیار کا اعتبار (1)	مفتی محمد سبطین رضا مرتضوی	21
شخصیات	انوار حیات	علامہ شاہ ابراہیم رضا بریلوی اور ان کے تلامذہ	مولانا عابد چشتی	27
سیاسیات	آئینۂ وطن	بھارت میں Gen-Z جمہوری بیداری	پی اے پریم بابو/ مترجم مہتاب پیامی	31
تاریخیات	یاد ماضی	عالم بیگ- انقلاب 1857 کا ایک تحقیقی بیانیہ (2)	مہتاب پیامی	34
طبیات	حفظان صحت	اجوائن خراسانی کے فوائد	ڈاکٹر ام فرح (ایم ڈی)	43
بزم خواتین	چراغ خانہ	ماں کی حیثیت سے تربیت کی ذمہداری	سلمٰی شاہین امجدی	44
ادبیات	نقد و نظر	مکتوبات حافظ بخاری کی تاریخی و ادبی جہتیں	مبصر: توفیق احسن برکاتی	47
	خیابان حرم	تقدیسی ترانے	علامہ یاور وارثی، ثاقب قمری مصباحی، نعمان اظہر مصباحی	49
وفیات	سفر آخرت	تعزیتی تحریریں ــــ از قلم: ❁ علامہ عبد الحفیظ مصباحی ❁ مفتی بدر عالم مصباحی ❁ مولانا ضیاء المصطفیٰ نظامی ❁ محمد عارف رضا نعمانی مصباحی ❁ مولانا رحمت اللہ مصباحی		50
مکتوبات	صدائے بازگشت	❁ مفتی محمد انور عالم مصباحی ❁ جاوید بھارتی		55
سرگرمیاں	خیر و خبر	محفل ایصال ثواب		58

اداریہ

ہم ایک بیمار قوم ہیں

مہتاب پیامی

”ہم ایک بیمار قوم ہیں“، اس جملے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ہمارے اوپر کسی جسمانی وبا یا مہلک وائرس نے حملہ کر دیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد ایک ایسی اجتماعی ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی بیماری ہے جو ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کرنے کے درپے ہے۔ جسمانی بیماری کا علاج دواؤں سے ہو جاتا ہے، لیکن جب کسی قوم کا شعور، اس کا ضمیر اور اس کا اخلاقی نظام بیمار ہو جائے، تو اس کی تشخیص اور علاج کے لیے صدیوں کی محنت درکار ہوتی ہے۔

آج ہم جس فتنہ خیز دور میں سانسیں لے رہے ہیں، وہاں بحیثیتِ مجموعی ہمارا معاشرہ شدید بحران کا شکار ہے، ہمارے ساتھ ساتھ ہماری پوری قوم تضادات کا مجموعہ بن چکی ہے۔ ہماری کتھنی اور کرنی میں فرق ہے، ہمارے دعووں میں جھول ہے، ہماری ذات کے اندر وہ خلیج ہے جو کسی طرح بھرنے کا نام نہیں لیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ایک ایسی قوم بن چکے ہیں جو بظاہر زندہ نظر آتی ہے، لیکن اندر سے اس کے سماجی اور اخلاقی ڈھانچے کے پرزے پرزے ہو چکے ہیں۔

یاد رکھیے! کسی بھی قوم کی صحت کا حقیقی ادراک اس کے شفاخانوں سے نہیں، بلکہ اس کی تعلیم گاہوں، اس کے نظامِ عدل وانصاف، اس کے بازاروں اور اس کے گلی کوچوں میں لوگوں کے رویّوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اخلاقی فقدان اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ اب ہمیں یہ غیر معمولی نہیں لگتا۔

ہماری سب سے بڑی بیماری اجتماعی منافقت ہے۔ ہم دنیا کے سامنے بلند بانگ اخلاقی اور مذہبی دعوے کرتے ہیں، لیکن ہماری عملی زندگی ان دعووں کے بالکل برعکس ہے۔ ہم کرپشن کے خلاف گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں، لیکن لائن میں اپنی باری کا انتظار کرنے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہم سود، رشوت اور جھوٹ کو گناہ سمجھتے ہیں، لیکن اپنے ذاتی مفاد کے لیے اسے مصلحت کا نام دے کر اپنا لیتے ہیں۔

معاشرتی منافقت اور جو ہم کہتے ہیں اس کے نہ کرنے کی عادت پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے:

”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○“

”اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔“ (الصف: 2،3)

ہمارے معاشرے میں جو ظاہر کی نمائش اور باطن کا کھوکھلا پن ہے، اس پر غوث اعظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اس باطنی بیماری کی عین نشاندہی کرتا ہے:

”تمھارا لباس تو زاہدوں جیسا ہے مگر تمھارے دل شکاریوں جیسے ہیں۔ تمھاری زبانیں تو شکر گزار ہیں مگر تمھارے دل اپنوں اور بیگانوں سے گلے شکووں سے بھرے ہیں۔ تم دنیا کے سامنے تو نیک بنتے ہو مگر تنہائی میں خدا کے سامنے نافرمانی کرتے ہو۔ یہ بدترین باطنی بیماری ہے۔“

ہم بولنا تو خوب جانتے ہیں مگر ہمارے پاس سننے کا حوصلہ ختم ہو چکا ہے۔ مذہب، سیاست، سماجیات کسی بھی پہلو پر گفتگو کیجیے، مگر آپ کی رائے کو سامنے بیٹھا انسان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سامنے بیٹھے انسان کی بات کیا کیجیے، ہم خود ہی اس سامنے بیٹھے

انسان کی باتیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اختلافِ رائے کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے گالی، گولی اور بے دلیل بیانات سے دیا جاتا ہے۔ یہ ذہنی بیماری معاشرے کو اندر سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہے۔

جدید دور کی اس بیماری نے ہمارے خاندانی اور سماجی نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ انسان کی قیمت اب اس کے کردار، علم یا تقویٰ سے نہیں، بلکہ اس کی گاڑی، بنگلے اور برانڈڈ کپڑوں سے لگائی جاتی ہے۔ تقاریب اب خلوص کے بجائے دولت کی نمائش کا ذریعہ بن چکی ہیں جس کے سبب مڈل کلاس طبقے کو شدید نفسیاتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک صحت مند معاشرہ وہ ہے جہاں قانون کی بالادستی ہو اور قانون توڑنے والے کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت حال الٹ ہے۔ یہاں جو شخص جتنا بڑا قانون شکن ہے، اسے اتنا ہی "بااثر" اور "پہنچا ہوا" سمجھا جاتا ہے۔

جب کوئی معاشرہ طویل عرصے تک ناانصافی، بے یقینی اور معاشی دباؤ کا شکار رہتا ہے، تو وہ نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ ہماری قوم اس وقت شدید نفسیاتی بحرانوں سے گزر رہی ہے اور بیماری کے آخری اسٹیج پر ہے۔ آپ کسی بھی گلی، محلے یا چائے کے ہوٹل پر بیٹھ جائیں، آپ کو ہر دوسرا شخص نظام کا رونا روتا نظر آئے گا۔ معاشرے میں یہ احساس عام ہو چکا ہے کہ "یہاں کچھ نہیں ہو سکتا"۔ یہ ناامیدی سب سے خطرناک بیماری ہے کیوں کہ یہ انسان سے آگے بڑھنے اور تبدیلی لانے کی طاقت ہی سلب کر لیتی ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہے کیوں کہ یہاں انھیں اپنے مستقبل کا افق تاریک نظر آتا ہے۔

ہم بحیثیت قوم ہمیشہ اپنی ناکامیوں کا ٹھیکرا دوسروں کے سر پھوڑتے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو بھی برا ہوتا ہے، ہم اسے "عالمی سازش"، "دشمن کی چال" یا "قسمت کا کھیل" کہہ کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کرنا اور خود کو ہمیشہ مظلوم سمجھنا، یہ بھی ایک بہت بڑی ذہنی بیماری ہے۔

ہمارا میڈیا اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ ہم نفسیاتی طور پر کتنے بکھرے ہوئے ہیں۔ صبح سے شام تک سنسنی خیزی، منفی خبریں، ٹرولنگ، اور ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ بن چکا ہے۔ ہم مثبت اور تعمیری چیزوں کے بجائے منفی اور تخریبی چیزوں سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ آج کل سوشل میڈیا پر دوسروں کی جاسوسی اور پگڑیاں اچھالنے کی جو بیماری ہے، اس کی جڑ قرآن نے یوں کاٹی ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ" (الحجرات:12)

"اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کرو، اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔"

تعلیم کسی بھی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ہمارا تعلیمی نظام بذاتِ خود ایک بڑی بیماری بن چکا ہے۔ ہمارا تعلیمی بحران یہ ہے کہ ہم رٹّا سسٹم کے پر کٹے طوطے کی طرح ہیں، ہمارے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں علم نہیں دیا جا رہا، بلکہ صرف معلومات کو رٹنے اور امتحانات میں اگلنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ہم ایسی نسلیں پیدا کر رہے ہیں جن کے پاس ڈگریاں تو ہیں، لیکن وہ تخلیقی سوچ (Critical Thinking) سے بالکل عاری ہیں۔ ہم سوال کرنے والے بچے کو گستاخ سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے فکری جمود پیدا ہو چکا ہے۔

قرآن مجید میں صرف ڈگریاں جمع کرنے یا بنا سوچے سمجھے کتابیں لادنے والوں کی مثال یوں بیان کی گئی ہے:

”مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۝“(سورۃ الجمعہ:5)

”ان لوگوں کی مثال جن پر تورات لادی گئی پھر انھوں نے اس کا حق نہ اٹھایا (اسے نہ سمجھا)، اس گدھے کی طرح ہے جو بہت سی کتابیں پیٹھ پر لادے ہوئے ہو۔“

ایسا تعلیمی نظام جو انسان کو صرف مادی فائدہ دے لیکن اخلاقی طور پر بیمار رکھے، اس سے ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پناہ مانگتے تھے، فرماتے ہیں:

”اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ.“(سنن ابن ماجہ)

”اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو (انسان اور معاشرے کو) نفع نہ دے۔“

ایک ہی ملک میں تین چار قسم کے تعلیمی نظام چل رہے ہیں۔ امیروں کے لیے الگ (او اور اے لیول)، مڈل کلاس کے لیے الگ (سرکاری یا سستے پرائیویٹ اسکول) اور غریبوں کے لیے الگ (مدارس)۔ یہ نظام ایک قوم پیدا کرنے کے بجائے تین مختلف طبقات پیدا کر رہا ہے جو ایک دوسرے کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہماری تعلیم کا مقصد صرف ایک اچھی نوکری کا حصول رہ گیا ہے۔ تعلیم کا جو اصل مقصد تھا، یعنی انسان کو ”انسان“ بنانا، اسے سچائی، دیانت داری اور ہمدردی سکھانا، وہ کہیں پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے پڑھے لکھے لوگ بھی اسی کرپشن اور بدعنوانی کا حصہ ہیں جس کا ایک ان پڑھ شخص ہے۔

تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ہمارے سیاسی ادارے بھی اسی بیماری کا حصہ ہیں۔ ہماری سیاست نظریات کے بجائے شخصیات کے گرد گھومتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دور میں سیاسی وابستگی اب ایک عقیدت بن چکی ہے، جس میں عقل اور منطق کا کوئی دخل نہیں رہا۔

جب کسی ملک میں میرٹ کا قتل عام ہو جائے، تو اس کے ادارے معذور ہو جاتے ہیں۔ سفارش، رشوت اور اقربا پروری نے ہمارے اداروں کو اس حد تک کمزور کر دیا ہے کہ وہ عام شہری کو انصاف، تحفظ یا بنیادی سہولیات فراہم کرنے کے قابل نہیں رہے۔ جب عدالتوں، پولیس اور انتظامیہ سے انصاف اٹھ جائے، تو قوموں کا جنازہ نکلنے میں دیر نہیں لگتی۔ پورے ملک کے تمام وسائل پر چند خاندانوں، بیوروکریٹس اور بااثر افراد کا قبضہ ہے۔ غریب ٹیکس دیتا ہے لیکن اسے صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں، یہ معاشی ناانصافی معاشرے میں جرم اور نفرت کو جنم دے رہی ہے۔

حدیثِ مبارکہ ہے: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ”قیامت کب آئے گی؟“ فرمایا:

”إِذَا وُسِّدَ الأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.“(بخاری شریف)

”جب معاملات (اور عہدے) نااہل لوگوں کے سپرد کر دیے جائیں، تو پھر قیامت (تباہی) کا انتظار کرو۔“

مذہب انسان کی اخلاقی اصلاح کے لیے آیا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہم نے مذہب کو بھی اپنی بیماریوں کا اوزار بنا لیا ہے۔ ہم دین کے ظاہری پہلوؤں پر تو بہت زور دیتے ہیں، لیکن دین کی روح، یعنی حقوق العباد، سچائی، امانت داری، اور دوسروں کے لیے خیر اندیشی، ان تمام امور کو فراموش کر چکے ہیں۔ مسجدیں بھری پڑی ہیں، لیکن بازاروں میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی اور دھوکہ دہی عروج پر ہے۔ یہ تمام بیماریاں راتوں رات پیدا نہیں ہوئیں، بلکہ ان کے پیچھے صدیوں کا تاریخی اور استعماری پس منظر ہے۔

غلامانہ ذہنیت، آقائی اور غلامی کا تصور، اپنے کلچر سے نفرت۔ یہ بیماری استعماری دور (Colonial Era) کی پیدا کردہ ہے اور سیاسی شعور کا خاتمہ، قانون کی بے توقیری کا رجحان آمرانہ ادوار (Dictatorships) کی وجہ سے وجود میں آیا۔

غلامی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم سے اس کی خودداری اور آزادانہ سوچ چھین لیتی ہے۔ ہم جسمانی طور پر تو آزاد ہو گئے، لیکن ذہنی طور پر آج بھی اسی استعماری نظام کے غلام ہیں جہاں طاقت ور ہمیشہ قانون سے اوپر ہوتا ہے۔

یاد رکھیں اگر ہم نے اب بھی اپنی بیماریوں کا اعتراف کر کے ان کا علاج نہ کیا، تو تاریخ کے صفحات میں ہمارا نام عبرت بن کر رہ جائے گا۔ ان بیماریوں سے شفایابی کے لیے درج ذیل اقدام ناگزیر ہیں:

- ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو ڈگری بانٹنے والی فیکٹری کے بجائے کردار سازی کا مرکز بنانا ہوگا۔
- نصاب میں اخلاقیات، شہری ذمہ داریوں (Civic Sense) اور انسانی حقوق کو شامل کرنا ہوگا۔
- بچوں کو رٹا لگانے کے بجائے سوال کرنے اور سوچنے کی آزادی دی دینی ہوگی، طبقاتی تعلیمی نظام کو ختم کرنا ہوگا۔
- جب تک ملک کے صدر اور ایک عام شہری کے لیے قانون برابر نہیں ہوگا، معاشرہ صحت مند نہیں ہو سکتا۔
- عدالتوں کو آزاد، تیز رفتار اور سفارشی اثر ورسوخ سے پاک ہونا پڑے گا۔ جب مجرم کو سزا کا خوف ہوگا، تو آدھی بیماریاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔
- میڈیا کو سنسنی خیزی اور منفی پروپیگنڈے کے بجائے قوم کی فکری تربیت کا ذریعہ بننا ہوگا۔
- سوشل میڈیا پر ایسے قوانین اور ضابطے لاگو کرنے ہوں گے جو جھوٹی خبروں، نفرت انگیز تقاریر اور کسی کی کردار کشی کو روک سکیں۔
- تبدیلی کا آغاز ہمیشہ فرد سے ہوتا ہے۔ جب تک ہر شخص اپنی ذات کا محاسبہ نہیں کرے گا، معاشرہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں "پہلے میں" کے اصول کے تحت آگے بڑھ کر یہ عہد کرنا ہوگا کہ "میں جھوٹ نہیں بولوں گا، میں رشوت نہیں دوں گا، میں قانون کا احترام کروں گا۔" وغیرہ، کیوں کہ ــــــــ

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "(الرعد:11)

"بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف (اور حالت) کو نہ بدل ڈالیں۔"

آیت کریمہ کے اس مفہو کو ڈاکٹر اقبال نے انتہائی خوب صورتی کے ساتھ کچھ اس طرح نظم کیا۔

خدا نے آج تک ــــ اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نعمت، امن، اور عروج عطا فرماتا ہے، تو وہ اسے تب تک نہیں چھینتا جب تک وہ قوم خود کو بد عنوانی، ظلم، اور اخلاقی پستی میں مبتلا نہ کر لے۔ جیسا کہ سورہ الانفال کی آیت 53 میں فرمایا:

"ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ○"

"اللہ کسی ایسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہو، بدلنے والا نہیں ہے جب تک کہ وہ خود اپنے دلوں کی حالت کو نہ بدل دیں۔"

اسی طرح، اگر کوئی قوم ذلت، پستی، اور ملوکیت کا شکار ہے، تو اس پر خدا کا عذاب یا بد حالی تب تک مسلط رہتی ہے جب تک وہ

قوم خود اٹھ کر، شعور بیدار کر کے، اپنی اصلاح کی جدوجہد شروع نہ کرے۔

یہ آیت انسان کو مظلومیت کے احساس (Victim Complex) اور مایوسی سے نکالتی ہے۔ ہمارا عام رویہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے حالات کی خرابی کا ذمہ دار ہمیشہ دوسروں (حکمرانوں، نظام، یا بیرونی سازشوں) کو ٹھہراتے ہیں (جیسا کہ ہم نے ماقبل میں تحریر کیا)۔ یہ آیت ہماری اس سوچ کی نفی کرتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ بیرونی حالات دراصل ہمارے اندرونی حالات کا عکس ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے کے افراد انفرادی طور پر بددیانت، سست اور مفاد پرست لوگ ہوں، تو ان پر مخلص اور عادل حکمران مسلط نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ حدیثِ مبارکہ میں ہے:

"كَمَا تَكُونُوا يُوَلَّى عَلَيْكُمْ." (مستدرک حاکم)

"جیسے تم خود ہوگے، ویسے ہی تم پر حکمران مسلط کیے جائیں گے۔"

مفسرین اور محدثین کرام اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہ دراصل ایک آفاقی سماجی قانون ہے۔ رعایا (عوام) اصل ہوتی ہے اور حکمران ان کا عکس ہوتے ہیں۔ اگر عوام صالح، دیانت دار اور انصاف پسند ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان پر عادل حکمران مسلط فرمائے گا۔ اور اگر عوام خود بددیانتی، ناانصافی اور اخلاقی پستی کا شکار ہو جائیں، تو مکافاتِ عمل کے طور پر ان پر ظالم اور مفاد پرست حکمران مسلط کر دیے جاتے ہیں۔

یہ حدیث مبارکہ ہمیں سبق دیتی ہے کہ تبدیلی کبھی اوپر سے نیچے (Top-Down) نہیں آتی، بلکہ ہمیشہ نیچے سے اوپر (Bottom-Up) ہوتی ہے۔ حکومتیں، قوانین اور نظام تبھی بدلتے ہیں جب گلی، محلے اور بازار کے سطح پر موجود عام انسان اپنی نیت، اپنے اخلاق اور اپنی ذمہ داریوں کو بدلنے کا پختہ عزم کر لے۔

مذکورہ آیات و احادیث گھنگھور اندھیرے میں امید کا وہ چراغ ہیں جن کی شعاعیں یہ پیغام دے رہی ہیں کہ ــــــــــ

"تمھاری قوم کی تقدیر کسی اور کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ خود تمھارے اپنے ہاتھوں میں ہے"۔

ہمارا مقصد اس تحریر کے ذریعہ مایوسی پھیلانا نہیں بلکہ یہ احساس دلانا ہے کہ ہمارے اندر اب بھی سدھرنے کی امید باقی ہے۔ ہمارے پاس قرآن مجید کی صورت میں بہترین رہنمائی اور ہمارے بزرگوں کے کردار کی صورت میں بہترین نمونے موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم بھٹک رہے ہیں، یہی ہماری اصل بیماری ہے۔ ہم اپنے ضمیر کی آواز کو خود ہی دبا رہے ہیں، ہم خود اپنے ہاتھوں سے سچائیوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں جب تک ہم اس غلط فہمی سے باہر نہیں نکلیں گے کہ **"خرابی صرف دوسروں میں ہے اور ہم خود بالکل ٹھیک ہیں"**، تب تک ہمارے حالات نہیں بدل سکتے۔ ہمیں کھوکھلے دعووں سے اجتناب کرنا ہوگا، قول و فعل کے اس تضاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہوگا کیوں کہ: **"قومیں صرف نقشوں پر لکیریں کھینچنے یا بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنے سے زندہ نہیں رہتیں، بلکہ وہ عام انسانوں کی سچائی، عدالتوں کے سچے انصاف اور تعلیمی اداروں کی اچھی تربیت سے زندہ رہتی ہیں"۔**

ذہنی غلامی کی جن زنجیروں میں ہم جکڑے ہوئے ہیں، انھیں توڑنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اپنی ذات سے پہل کی جائے۔ یاد رکھیے، ہماری تقدیر کسی معجزے سے نہیں بدلے گی، بلکہ یہ اس وقت بدلے گی جب ایک عام انسان اپنی نیت، اپنے اخلاق اور اپنی ذمہ داریوں کو بدلنے کا سچا عزم کر لے گا، کیونکہ **"معاشرے کی اصلاح کا پہلا قدم ہمیشہ اپنی ذات کی اصلاح سے ہی شروع ہوتا ہے"۔**

❁❁❁❁❁

تفہیم قرآن

قرآن مجید میں جلوۂ جمالِ رسول ﷺ

محمد حبیب اللہ بیگ ازہری۔ استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

الحمد لولیه، والصلاة والسلام علی نبیه، وعلی آله وأصحابه وأتباعه المتأدبین بآدابه.

رفیقان گرامی! اس وقت ہم اور آپ ماہ صفر کے آخری ایام سے گزر رہے ہیں، چند دنوں کی بات ہے کہ پھر وہ ماہ مبارک جلوہ فگن ہوگا جس میں ہم سب کے آقا و مولیٰ حضور رحمت عالم نور مجسم شفیع معظم فخر آدم و بنی آدم جناب محمد رسول اللہ ﷺ اس خاکدان گیتی پہ جلوہ فرما ہوئے، اور اپنے وجود ناز کی زندہ جاوید خوشبوؤں سے ساری کائنات کو رشک گلستاں بنادیا۔

جب بھی اس ماہ مبارک کی آمد ہوتی ہے ہر سو خوشیوں کی لہر دوڑ جاتی ہے، پھر ہر طرف مسرتوں کی بہاریں ہوتی ہیں، ہر سمت کیف و مستی کا سماں ہوتا ہے، ہر طرف آپ ہی کی عظمتوں کے ترانے ہوتے ہیں، ہر زبان پہ آپ ہی کی تعریف و توصیف ہوتی ہے، ہر ساز میں آپ ہی کی لے ہوتی ہے، ہر پھول میں آپ ہی کی خوشبو ہوتی ہے، ہر سحر آپ کی محبتوں سے سرشار ہوتی ہے، ہر صبح آپ کی زلفوں کی اسیر ہوتی ہے، ہر شام آپ کی یادوں کی امین ہوتی ہے۔

ہر پھول میں بو تیری ہر شمع میں ضو تیری
بلبل ہے ترا بلبل پروانہ ہے پروانہ

عزیزان گرامی! جب یہ ماہ مبارک ضوفگن ہوتا ہے تو آسمان کی بلندیوں میں، زمیں کی پستیوں میں، سمندر کی گہرائیوں میں، فضاؤں کی وسعتوں میں، جنت کی کیاریوں میں غرضیکہ ہر گوشۂ کائنات میں بس آپ ہی کے نام کے وظیفے پڑھے جاتے ہیں، آپ ہی کی عظمتوں کے چرچے ہوتے ہیں، آپ ہی کے فضائل و مناقب بیان ہوتے ہیں، المختصر۔

عرش پہ تازہ چھیڑ چھاڑ فرش پہ طرفہ دھوم دھام
کان جدھر لگایئے تیری ہی داستان ہے

عزیزان گرامی! ہم اس ماہ مبارک سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، اور کیوں نہ کریں کہ اسی ماہ مبارک میں وہ رسول ہاشمی تشریف لائے جن کی عظمتیں قرآن پاک میں جا بجا بیان ہوئی ہیں، دیکھیے رب کائنات نے آپ کے سراپا کو کس انوکھے انداز میں بیان فرمایا۔

رب کائنات نے آپ کے رخ انور کا ذکر کیا تو فرمایا کہ: ﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾۔ اے محبوب ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی جانب اٹھانا دیکھ رہے ہیں۔

رب کائنات نے آپ کی زبان فیض ترجمان کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی 003 اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾

یہ وہ مبارک زبان ہے جس کی ہر بات وحی الٰہی ہے۔

رب کائنات نے آپ کی نگاہ ناز کا ذکر کیا تو:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی 0017 لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی﴾

اللہ کی عظیم ترین نشانیوں کو دیکھنے کے دوران یہ نگاہیں نہ جھپکیں نہ حد سے متجاوز ہوئیں۔

رب کائنات نے آپ کے گوش مبارک کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾

یہ تمھاری خیر خواہی کرنے والے کان ہیں، اللہ پہ ایمان رکھنے والے کان ہیں، مومنوں پہ یقین کرنے والے کان ہیں، مومنوں پر کرم گستری کرنے والے کان ہیں۔

رب کائنات نے آپ کے قلب اطہر کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ 00192 نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ 00193 عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ 00194 بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ﴾

جبریل امین اسی دل پہ کلام الٰہی لے کر نازل ہوتے رہے۔
رب کائنات نے آپ کے سینۂ مبارک کا ذکر کیا تو فرمایا:
﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾
ہم نے اس سینہ کو وسیع و کشادہ بنا دیا۔
رب کائنات نے آپ کی پشت اقدس کا ذکر کیا تو فرمایا:
﴿وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ 2 الَّذِیْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾
ہم نے آپ کی پشت سے اس بوجھ کو اتار دیا جس نے آپ کو کمزور کر رکھا تھا۔
رب کائنات نے آپ کے دست حق پرست کا ذکر کیا تو فرمایا:
﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ﴾
جو لوگ آپ کے دست حق پرست پہ بیعت کرتے ہیں وہ اللہ کے دست قدرت پہ بیعت کرتے ہیں۔
رب کائنات نے آپ کی گزرگاہوں کا ذکر کیا تو فرمایا:
﴿لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ 1 وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾
شہر مکہ کی قسم جب تک آپ اس شہر میں جلوہ فرما ہیں۔
رب کائنات نے آپ کی حیات طیبہ کا ذکر کیا تو فرمایا کہ:
﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾
قسم ہے آپ کی زندگانی کی، یہ لوگ اپنی گمرہی میں بھٹک رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا ترے شہر و کلام و بقا کی قسم

اعلیٰ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے آپ کے مبارک شہر، آپ کی مبارک زندگی اور آپ کی دل نشیں گفتگو کی قسم یاد فرمائی ہے، سورۂ بلد کی ابتدائی آیات میں آپ کے شہر مکہ کی قسم ہے، سورۂ حجر کی آیت نمبر 72 میں آپ کی حیات طیبہ کی قسم ہے، اور یہ دونوں آیتیں ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دی۔ جہاں تک بات ہے آپ کی گفتگو کی قسم کی، تو آئیے یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کی زبان حق بیان سے ادا ہونے والے مبارک کلمات کی قسم کس طرح یاد فرمائی ہے، سورۂ زخرف کی آیت نمبر 88 میں فرمایا:
﴿وَ قِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ﴾
قسم ہے اس ارشاد رسول کی کہ اے پروردگار یہ ایمان لانے والے نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے انھیں تین آیات میں وارد قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا ترے شہر و کلام و بقا کی قسم

عزیزان گرامی! ہماری پیش کردہ آیات سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بارگاہ ایزدی میں جو وجاہت و مقبولیت آپ کو حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں، کیوں کہ قرآن کریم میں جس شرح و بسط کے ساتھ آپ کے سراپا کو بیان کیا گیا اس کی نظیر دوسرے انبیا کے بیان میں نہیں ملتی، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ اولین و آخرین میں بے مثل و مثال ہیں۔ آپ کو ماتھے کی نگاہ سے دیکھنے والے جلیل القدر صحابی شاعر دربار رسالت حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وأحسن منك لم تر قط عيني
وأجمل منك لم تلد النســـــاء
خلـقـت مبرأ مـن كل عيب
كأنك قدخلقت كمـــا تشاء

یعنی آپ سے زیادہ خوبرو میری آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں، اور دیکھتی بھی کیسی جب کہ آپ سے زیادہ حسین و جمیل کسی عورت نے جنا ہی نہیں، آپ بے عیب پیدا ہوئے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی تخلیق آپ ہی کی مرضی کے مطابق ہوئی ہے۔
عزیزان گرامی! ہم اس ماہ مبارک سے محبت کرتے ہیں، اور بے پناہ محبت کرتے ہیں، اور کیوں نہ کریں کہ اسی ماہ مبارک میں وہ رسول اعظم تشریف لائے کہ خود خدا نے جن کی بارگاہ کے آداب بندوں کو سکھائے، اور ان کی بھرپور تعظیم و تکریم کا حکم دیا۔
ہر کام میں آپ ہی کو مقدم رکھنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾

یعنی راستہ چلنے میں، ماہ رمضان کا روزہ رکھنے میں، نماز عید کے بعد قربانی کرنے میں، رکوع وسجود میں غرضے کہ کسی بھی دینی ودنیوی کام میں ان پر سبقت نہ لے جاؤ۔ اس لیے کہ اللہ کی رضا نہ ان کے آگے آگے چلنے میں ہے، نہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے میں ہے، بلکہ اللہ کی رضا تو ان کے پیچھے پیچھے چلنے میں ہے، ارشاد باری ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

اے محبوب! اپنی امت سے فرمادو کہ اگر تم صحیح معنی میں اللہ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری اطاعت کرو، اللہ تمھیں اپنا محبوب بنالے گا، اور تمھیں بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

رب کائنات نے متعدّد مقامات پر آپ سے عرض ونیاز کے آداب بیان فرمائے، آپ کو ندا کرنے کا طریقہ یہ بیان فرمایا:

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾

رسول اللہ ﷺ کو اس طرح نام لے کر نہ پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ لہذا ان کی حیات ظاہری ہو کہ حیات برزخی، جب بھی ان کو پکارنا ہو تو یا رسول اللہ کہہ کر پکارو، یا حبیب اللہ کہہ کر پکارو، یا نبی اللہ کہہ کر پکارو، یا نور اللہ کہہ کر پکارو، یا خیر خلق اللہ کہہ کر پکارو، اور اس یقین کے ساتھ پکارو کہ

فریاد امتی جو کرے حال زار میں
ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو
واللہ وہ سن لیں گے فریاد کو پہنچیں گے
اتنا بھی تو ہو کوئی جو آہ کرے دل سے

رب ذوالجلال نے آپ سے ہم کلامی کا طریقہ یہ بیان فرمایا:

﴿لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾

میرے نبی کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو، اور ان سے اس طرح چلا چلا کر بات نہ کرو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے ہو۔ قربان جائیے آپ کے لامتناہی کمالات پر، قربان جائیے بارگاہ خداوندی میں آپ کی وجاہت ومقبولیت پر کہ قرآن کریم نے نہ صرف یہ کہ آپ کے حضور آواز پست کرنے کا حکم دیا، بلکہ آپ کے حضور آواز پست کرنے والوں کے متقی ہونے کی شہادت دے دی، اور ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا، چناں چہ اگلی آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾

یعنی جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور اپنی آواز پست کر لیتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے لیے چن لیا ہے، ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

رب کائنات نے آپ کی مجلس میں حاضری اور آپ سے اکتساب فیض کے آداب یوں بیان فرمائے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ﴾

نبی جب تمھیں حیات نو عطا کرنے کے لیے یاد فرمائیں تو اپنے سارے فرائض وواجبات کو چھوڑ کر علی الفور حاضر بارگاہ ہو جاؤ، اور ان کے حکم کی تعمیل کو ہر فرض پر مقدم جانو۔ اعلیٰ حضرت کیا خوب فرماتے ہیں:

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

رب کائنات نے آپ سے استفسار کا طریقہ یہ بیان فرمایا کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾

اگر دوران درس کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو راعنا نہ کہو، بلکہ انظرنا کہو۔ کیوں کہ راعنا کہہ کر کچھ دریدہ دہن آپ شان اقدس میں توہین کی گنجائش نکال لیتے ہیں، مزید فرمایا کہ پہلے ہی سے اس قدر ہمہ تن گوش ہو کر سنو کہ نہ راعنا کہنے کی ضرورت پیش آئے نہ انظرنا

کہنے کی حاجت باقی رہے، جو آپ کا گستاخ ہے وہ کان کھول کر سن لے کہ آپ کا گستاخ ہے کافر ہے، اور ایسے کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رب کائنات نے دوران درس بغرض ضرورت آپ کی مجلس سے نکلنے کے آداب یہ بیان فرمائے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾

یعنی ان کی مجلس سے بے اجازت نہ جاؤ، کیوں کہ ان کی مجلس علم و حکمت سے اجازت لے کر اٹھنا ہی مومن کامل ہونے کی دلیل ہے۔

رب کائنات نے آپ کے کاشانۂ اقدس پہ حاضری کا طریقہ یہ بیان فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ004 وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

یعنی میرے محبوب کو ان کی آرام گاہوں کے باہر سے نہ پکارو، کیوں کہ جو لوگ انھیں ان کے کمروں کے باہر سے پکارتے ہیں وہ بڑے بے عقل ہیں، آپ کے دردولت پہ حاضری کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ قدوم فیض میں پہنچ کر انتظار کیا جائے یہاں تک کہ آپ خود باہر تشریف لے آئیں، اور آنے والوں کو اپنی زیارت وملاقات سے شرف یاب فرمائیں۔

سورۂ احزاب میں آپ کے کاشانۂ اقدس پہ منعقد ہونے والے دعوت طعام میں شرکت کا طریقہ یہ بیان فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ﴾

یعنی بے اجازت نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو جاؤ، اور اگر دعوت طعام کے لیے مدعو کیے جاؤ تو کھانا تیار ہونے سے پہلے نہ پہنچ جاؤ، اور کھانے سے فراغت کے بعد فوراً واپس ہو جاؤ، باتوں میں مصروف نہ رہو، کیوں کہ اس سے نبی کو اذیت پہنچتی ہے۔

رب کائنات نے آپ کے فیصلوں کا احترام کرنے اور آپ کے فیصلوں کو کھلے دل سے تسلیم کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾

آپسی اختلافات اور نزاعی امور میں انھیں کو حکم بناؤ، اور ان کے جملہ فیصلوں کو بسر وچشم قبول کرو، قسم ہے اس رب اکبر کی جس کے دست قدرت میں محمد عربی ﷺ کی جان ہے تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک تم انھیں اپنا حکم اور فیصل تسلیم نہ کر لو۔ مزید آپ کے فیصلوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾

رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ در اصل اللہ ہی کا فیصلہ ہے، اسی لیے ان کے فیصلہ کے بعد اپنے ذہن وفکر میں گردش کرنے والے سارے فیصلوں کو بھول جاؤ، اور انھیں کے فیصلوں کو حتمی اور آخری فیصلہ تسلیم کر لو۔

عزیزان گرامی! دیکھا آپ نے، خالق لم یزل عزوجل کی بارگاہ میں آپ کی وجاہت و مقبولیت، رب کائنات کو یہ قطعاً منظور نہیں کہ کوئی کسی بھی مباح کام میں آپ پہ سبقت لے جائے، اسی لیے بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمادیا کہ کسی بھی کام میں نبی پر سبقت نہ لے جاؤ۔ رب کائنات کو یہ قطعاً منظور نہیں کہ کوئی آپ کے حضور آواز بلند کرے، اسی لیے بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمادیا کہ نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔ رب کائنات کو یہ قطعاً منظور نہیں کہ کوئی آپ کا نام لے کر آپ کو مخاطب کرے، اسی لیے بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمادیا کہ نبی کو اس طرح نہ پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ رب کائنات کو یہ قطعاً منظور نہیں کہ کوئی آپ کی مجلس فیض سے بے اجازت چلا جائے، اسی لیے بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمادیا نبی کی درس گاہ سے بے اجازت نہ

جاؤ۔ غرضے کہ ہر ہر معاملہ میں حد درجہ ادب واحترام کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا، اور ایسے کلمات کو زبان پر لانے سے منع کردیا جس میں کور بختوں کے لیے بے ادبی اور گستاخی کی کوئی گنجائش نکلتی ہو۔

عزیزان گرامی! ہم اور آپ حضور ﷺ کی کیا تعریف کرسکتے ہیں، جب کہ خلاق اکبر خود آپ کی تعریف بیان فرمارہا ہے، اعلیٰ حضرت نے بڑے پیارے انداز میں فرمایا کہ:

اے رضا خود صاحب قرآں ہے مداح حضور
تجھ سے ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

عزیزان گرامی! ہم اس ماہ مبارک سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور کیوں نہ محبت کریں کہ اسی ماہ مبارک میں وہ رسول ہاشمی تشریف لائے کہ عرش کی رفعتیں جن کی عظمتوں کو سلام کرتی ہیں، اوج ثریا کی بلندیاں جن کے تلووں پہ نثار ہوتی ہیں، روح القدس کے موتی جن کے قدموں پہ سجدہ کرتے ہیں، چاند و سورج کی تابانی جن کے گزر گاہوں کے بوسے لیتی ہے، حور و ملک جن کے اشارۂ ابرو کے پابند رہتے ہیں، جن و انس جن کی غلامی پہ فخر کرتے ہیں، شاہ و گدا جن کے در پہ کاسۂ گدائی لیے ہمہ وقت کھڑے رہتے ہیں۔

اللہ رب العزت کی اس عطا پر کتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے کہ اس نے ہمیں آپ کی امت مرحومہ مغفورہ میں پیدا فرمایا، اور آپ کی محبتوں سے ہمارے سینوں کو معمور فرمایا، اللہ کا فضل ہے کہ آج بھی ہمارے شہر دل کی ہر گلی میں آپ کی محبتوں کی ہزاروں قندیلیں روشن ہیں، ہمارے نہاں خانۂ دل کے ہر گوشہ میں آپ ہی کی محبتوں کے اجالے ہیں، ہمارے نخل تمنا کی شاخوں پہ چہکنے والے عنادل آپ ہی کے ترانے پڑھتے ہیں، ہمارے گلشن خیال میں کھلنے والے گلاب آپ ہی کے رخ زیبا کی ثنا کرتے ہیں۔

عید میلاد کے اس پر بہار موقع پر جہاں ہم پر یہ لازم وضروری ہے کہ ہم آپ کی آمد کی خوشیاں منائیں وہی ہم پر یہ بھی لازم وضروری ہے کہ ہم اپنے کردار وعمل سے آپ کو خوش کریں، اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے: وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ ایمان واسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ عزوجل اور اس کے پیارے رسول ﷺ کو راضی کیا جائے، اپنے حسن عمل اور اعلیٰ کردار کے ذریعہ انھیں خوش کیا جائے۔

لہٰذا اہم پر ضروری ہے کہ ہم نماز پنج گانہ باجماعت ادا کرکے اللہ ورسول کو راضی کریں۔ ایمان واحتساب کے ساتھ ماہ رمضان کے مکمل تیس روزے رکھ کر اللہ ورسول کو راضی کریں۔ شرائط پا لیے جانے پر خالصۃً لوجہ اللہ زکات ادا کرکے اللہ ورسول کو راضی کریں۔ صاحب استطاعت ہونے کے بعد علی الفور حج کرکے اللہ ورسول کو راضی کریں ۔ فرائض وواجبات کو ادا کرکے اور محرمات ومنہیات سے گریز کرکے اللہ ورسول کو راضی کریں۔ غریبوں کی، فقیروں کی، یتیموں کی، مسکینوں کی، بیواؤں کی اور مظلوموں کی فریاد رسی کے ذریعہ اللہ ورسول کو راضی کریں۔ کفر وشرک، الحاد و بے دینیت، بدعت وگمراہیت، اور ہر قسم کے فسق وفجور سے کلی اجتناب کے ذریعہ اللہ ورسول کو راضی کریں۔ مختصر یہ کتاب وسنت پر سختی سے عمل پیرا ہوکر اللہ ورسول کو راضی کریں۔ عید میلاد النبی ﷺ کے پر بہار موقع پر ہمارا یہی پیغام ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طاعت وفرمانبرداری کو اپنے لیے لازم کرلو، اور یاد رکھو کہ آپ کی غیر مشروط اطاعت ہی آپ سے سچی الفت ومحبت کی دلیل ہے۔ میں اپنی گفتگو کو حضور مفتی اعظم کے ان اشعار پر ختم کرتا ہوں:

دم واپسی تک ترے گیت گاؤں
محمد محمد پکارا کروں میں
خدا ایک پر ہو تو اک پر محمد
اگر قلب اپنا دوپارہ کروں میں
مجھے ہاتھ آئے اگر تاج شاہی
تری کفش پا پر نثارا کروں میں
یہ اک جان کیا ہے اگر ہو کروڑوں
ترے نام پر سب کو وارا کروں میں

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین
سوال آپ بھی کر سکتے ہیں

آپ کے مسائل

مفتی محمد نظام الدین رضوی

یورپ میں عصر مثل اول اور عشا شفق احمر میں پڑھنے کا حکم

سوال: یورپ میں احناف کے ساتھ ساتھ شوافع اور مالکیہ کی بھی بڑی تعداد آباد ہے۔ نیز احناف میں بھی پاک و ہند کے علاوہ ترکی حنفی خاصی تعداد میں موجود ہیں، جن کی بنسبت پاک و ہند سے تعلق رکھنے والوں کی مساجد بہت کم ہیں۔ اس لیے یورپ کی اکثر و بیش تر مساجد میں عصر مثل اول جب کہ عشا شفق احمر پر پڑھنے کا معمول ہے کیوں کہ شافعی و مالکی حضرات کا تو مذہب ہی یہی ہے جب کہ ترکی حنفی صاحبین کے قول پر عمل پیرا ہیں۔ اس صورت میں حال امام اعظم کے قول پر اوقات سیٹ کرنا شہر میں انوکھا طریقہ بنانا ہوگا اور کئی مسلمان اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں کہ پورے شہر میں ایک مسجد کا ٹائم الگ ہے بقیہ سارا شہر الگ وقت پر ہے۔

(1) کیا ایسے میں ہم اپنی مساجد میں بھی صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے عصر و عشا کا وقت رکھ سکتے ہیں؟

(2) دوسری مساجد میں نماز پڑھیں تو اس وقت کے مطابق پڑھ سکتے ہیں؟ یا پھر وہاں نماز پڑھنے سے بچیں؟

(3) اس وقت میں پڑھی گئی نماز کا اعادہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:

(1، 2، 3) سوال سے ظاہر یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقلدین نے ظہر کی نماز کے سلسلے میں پابندی وقت نہیں کی اور دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرتے رہے اس لیے اب معمول قدیم کے خلاف اذان و جماعت کا اہتمام کریں گے تو اعتراض ہو سکتا ہے، اپنی شناخت پہلے سے کیوں نہیں بنائی گئی، اب ہونا یہ چاہیے کہ جن لوگوں کو اعتراض ہے ان کی تفہیم کی جائے اور ان کی ذہن سازی کر کے انھیں اعتراض سے بچانے کی کوشش کی جائے اور نمازِ عصر مذہب امام اعظم پر مثل دوم کے بعد پڑھی جائے۔

یہ الگ بات ہے کہ صاحبین رحمہما اللہ کے مذہب پر بھی نمازِ عصر صحیح ہوگی جیسا کہ امام احمد رضا قدس سرہ کے ملفوظات کا یہ سوال و جواب شاہد ہے۔

عرض: اگر قبل دو مثل کے عصر کی نماز پڑھ لی جائے تو ہو جائے گی؟

ارشاد: ہاں! صاحبین (یعنی امام اعظم کے دو جلیل القدر شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما) کے نزدیک ہو جائے گی۔ (غنية المتملي، شرح منية المصلي، الشرط الخامس، ص 227)

عرض: کیا اعادہ (یعنی نماز دوبارہ پڑھنا واجب نہ ہوگا؟

ارشاد: فرض نہ ہوگا کہ اس قول پر بھی فتوی دیا گیا ہے اگرچہ صحیح و معتمد قول امام ہے۔ (ملفوظات اعلیٰ حضرت ص 85،84، مجلس المدینۃ العلمیۃ)

یورپ میں ترکی حنفی اور مراقشی سنی کے پیچھے نماز کے جواز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اکثر یہاں یورپ میں ترکی

(حنفی) یا مراکشی (مالکی) مسلمانوں کی مساجد ملتی ہیں اور امام بھی سنی ہوتے ہیں۔ کیا ان کے پیچھے نماز پڑھی جاسکتی ہے؟ دراصل ان کی داڑھی عموماً خشخشی ہوتی ہے، ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں تو انگلیاں بھی اٹھتی ہیں کہ امام سنی ہے پھر بھی نماز نہیں پڑھتے، وغیرہ اور سفر میں بھی اکثر انھیں کی مساجد ملتی ہیں تو کیا کیا جائے؟

سائل: عبداللہ (اسپین)

الجواب: (1) حنفی مذہب میں داڑھی ایک مشت رکھنا واجب ہے اور یہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام کے آثار سے ثابت ہے۔ ہم نے شرح صحیح مسلم کے مقدمے وغیرہ میں وہ احادیث و آثار پیش کیے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت امام ابن الہمام کمال الدین حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مشت داڑھی رکھنے کے وجوب کی صراحت فرمائی ہے۔ یہی موقف افقہ امت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کا بھی ہے انھوں نے اس بارے میں ایک بہت ہی تحقیقی رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "لمعة الضحی فی اعفاء اللحی" اور یہی موقف ان کے تمام پیروکاروں کا بھی ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود ہمارا ایک چھوٹا سا گروہ ایک مشت داڑھی رکھنے کو واجب نہیں مانتا صرف سنت کہتا ہے اور اسی لیے وہ اس بات کا قائل ہے کہ داڑھی ایک مشت سے کم رکھنا بھی جائز ہے۔

تو عرض ہے کہ جن علما کا یہ موقف ہے اور جو لوگ اس بارے میں ان کے پیروکار ہیں وہ اگر داڑھی چھوٹی رکھتے اور نماز پڑھاتے ہیں تو ان کی اقتدا جائز ہے، نماز صحیح ہوگی البتہ خلاف سنت و خلاف اولی ہوگی جہاں عام طور پر حنفی امام اسی قسم کے ہوں مگر سنی صحیح العقیدہ ہوں ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اور جو شخص نہ تو داڑھی کے اس مسئلے میں محقق ہو اور نہ ہی محقق کا پیروکار۔ وہ اپنی جرأت بیجا کی وجہ سے یا فیشن زدہ حالات سے متاثر ہو کر داڑھی خَش خَشی رکھتا ہو اس کا حکم اس کے سوا ہے وہ اگر داڑھی خَش خَشی رکھنے کا عادی ہو تو اسے امام بنانا گناہ اور اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے کہ اس نے مُنکر مذہبی کا ارتکاب کیا۔

اس کی نظیر مزامیر کے ساتھ قوالی کا مسئلہ ہے کہ کسی صاحب علم و نظر شیخ نے اپنی تحقیق سے جواز کا مؤقف اختیار کیا ہو تو وہ اور اس کے پیروکار فسق سے محفوظ رہیں گے اور جو تحقیق و اتباع سے کنارہ کش محض لذت نفس کے لیے مزامیر کے ساتھ قوالی سنے وہ فاسق ہے۔ حضرت سیدی مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے فتاوی مصطفویہ میں اس طرح کی رہنمائی فرمائی ہے اور اس کے اور بھی نظائر ہیں۔ واللہ تعالی اعلم۔

(2) مالکی امام سنی صحیح العقیدہ ہو اور حنفی مذہب کے فرائض نماز کی رعایت کرتا ہو تو اس کے پیچھے بھی نماز صحیح ہے یہی حکم شافعی مذہب کے امام کا بھی ہے۔ سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے فتاوی رضویہ، جلد سوم میں یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔ واللہ تعالی اعلم۔ ■■■

جدید انداز میں اردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، کتابوں کی سیٹنگ، ٹائپنگ، بینر و پوسٹر کی ڈیزائننگ وغیرہ کے لیے رابطہ کریں۔ مخطوطات کی کمپوزنگ بھی نہایت مناسب اجرت پر کی جاتی ہے۔

پیامی کمپیوٹر گرافکس، مبارکپور

9235647041

شواھد و نتائج

معیار قطعیت و ظنّیت اور اختلاف متکلّمین و فقہا

سید حدیر الحسن شاہ

قطعی کی دو قسمیں ہیں۔

○ قطعی بالمعنیٰ الاخص ○ قطعی بالمعنیٰ الاعم

دونوں کا معیار فقہا و متکلّمین کے ہاں الگ الگ ہے۔

چند بنیادی چیزیں پہلے سمجھنا ضروری ہے۔

فقہاے کرام احتمال بعید کا لحاظ نہیں کرتے، بلکہ اس کو عدم کی منزل میں رکھتے ہیں جب کہ متکلّمین اس کا لحاظ کرتے ہیں۔

لہٰذا اس بنا پر قطعیت کا معیار دونوں کے ہاں مختلف ہو گیا اور دونوں کے ہاں اس کا مفہوم الگ الگ ہے۔

پہلے متکلّمین کے ہاں معیار قطعیت کے اعتبار سے اقسام کو سمجھیں۔

قطعی بالمعنیٰ الاخص: جس میں بالکل احتمال ہی نہ ہو، نہ احتمال قریب، نہ احتمال بعید۔

قطعی بالمعنیٰ الاعم: جس میں احتمال بعید ہو۔

فقہا کے ہاں متکلّمین کی قطعیت کی دونوں قسمیں قطعی بالمعنیٰ الاخص ہیں کیوں کہ فقہاے کرام احتمال بعید کا لحاظ نہیں فرماتے کما لا یخفی۔

پس قطعی بالمعنیٰ الاعم بھی فقہاے کرام کی نظر میں قطعی بالمعنیٰ الاخص کی طرح ہے۔ قطعی بالمعنیٰ الاخص میں احتمال بعید بھی نہیں ہوتا اور جب قطعی بالمعنیٰ الاعم میں بھی یہی فرض کر لیا گیا کہ اس میں بھی کوئی احتمال نہیں ہے تو وہ بھی قطعی بالمعنیٰ الاخص کی طرح ہو گیا۔

اب فقہاے کرام ظنی بالمعنیٰ الاعم کو قطعی بالمعنیٰ الاعم ملحق بالیقین شمار کرتے ہیں۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ قطعی کی دونوں قسمیں فقہاے کرام کے یہاں قطعی بالمعنیٰ الاخص ہیں اور ظنی بالمعنیٰ الاعم فقہاے کرام کے یہاں قطعی بالمعنیٰ الاعم ہے۔

ہر علم و فن کی جداگانہ اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اہل منطق فعل کو کلمہ بولتے ہیں اور اہل نحو کے یہاں کلمہ کا دوسرا معنی ہے۔

ظنی کی دو قسمیں ہیں۔

○ ظنی بالمعنیٰ الاعم ○ ظنی بالمعنیٰ الاخص

ظنی بالمعنیٰ الاعم وہ ہے جس میں احتمال قریب (احتمال بدلیل) ہو۔

ظنی بالمعنیٰ الاعم کو فقہا بھی ظنی مانتے ہیں لیکن علم طمانیت کا افادہ کرنے کے سبب اس کو ملحق بالقطعی مان لیتے ہیں

اسی لیے فقہا کے نزدیک وہ قطعی ملحق بالیقین ہے اسے ہی وہ قطعی بالمعنیٰ الاعم سے تعبیر فرماتے ہیں یہ درحقیقت ظن غالب ہوتا ہے اور علم فقہ میں ظن غالب کو یقین کی منزل میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ علم کلام میں وہ ظن غالب ہی رہتا ہے۔

اس میں احتمال بدلیل (احتمال قریب) موجود ہوتا ہے مگر دلیل ساقط الاعتبار ہوتی ہے اس لیے فقہاے کرام اس احتمال قریب کا لحاظ ہی نہیں کرتے بلکہ اسے احتمال بعید سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ متکلّمین اس دلیل کا لحاظ کرتے ہیں اگرچہ وہ ساقط الاعتبار ہے اور اسے احتمال قریب سے تعبیر فرماتے ہیں۔

ظنی بالمعنیٰ الاخص کا مفہوم یہ ہے کہ جس میں احتمال

syedhadeerulhassanshah09@gmail.com

بدلیل لائق اعتبار ہو۔

افادات

افادۂ اول: معیار کے مختلف ہونے کی بنا پر تکفیر کے معاملے میں فقہاو متکلّمین کا اختلاف واقع ہوا ہے اور اس اختلاف کا ثمرہ قطعی بالمعنیٰ الاعم کلامی والی صورت میں ظاہر ہوگا۔

یعنی فقہاے کرام ہر قطعی امر کے انکار کر تکفیر کرتے ہیں اور متکلّمین اپنے معیار کے مطابق قطعی بالمعنیٰ الاخص سے ثابت شدہ کے انکار پر تکفیر فرماتے ہیں تو قطعی بالمعنیٰ الاخص والی صورت میں تکفیر اجماعی اور قطعی بالمعنیٰ الاعم کلامی والی صورت میں تکفیر اختلافی ہوگی۔

افادۂ دوم: امام اہل سنت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

للفقهاء الكرام فى اكفار كل من انكر قطعيا و المتكلمون خصوه بالضروری و هو الاحوط ۔

(المستند المعتمد صفحہ 221 دار اہل السنہ کراچی)

مذکورہ بالا فرمان کی درست توضیح و تنقیح ملاحظہ کیجیے؛

جو جو امر دینی فقہاے کرام کے نزدیک قطعی بالمعنیٰ الاخص ہے اس کے منکر پر فقہا تکفیر کرتے ہیں فقہا کے قطعی بالمعنیٰ الاخص میں متکلّمین کی دونوں قطعیت کی قسمیں آجاتی ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ فقہا ہر امر قطعی ہے انکار پر تکفیر کرتے ہیں اس سے مراد یہی قطعی ہوتا ہے۔

فافهم هذا الكلام فانه من مزال الاقدام.

افادہ سوم: فقہاے کرام قطعی بدیہی ہو یا غیر بدیہی دونوں کے انکار پر تکفیر کرتے ہیں قطعی بدیہی سے مراد متکلّمین کی قسم قطعی بالمعنیٰ الاخص ہے اور یہ علم بدیہی کا افادہ کرتی ہے اور یہی قطعیت ضروریات دین کے ثبوت کے لیے مطلوب ہے اسی کو امام اہل سنت علیہ الرحمہ نے ضروریات دین کی تعریف میں ”واضحۃ الافادات“ سے تعبیر فرمایا۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 29 صفحہ 385)

اور کتب علم کلام میں اسی بداہۃ کو ”ضرورۃ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ والتحقيق عندى ان الضرورة ههنا بمعنى البداهة. (فتاویٰ رضویہ جلد 1 صفحہ 242)

اسی قسم کو متکلّمین قطعی ضروری سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

متکلّمین کی قسم قطعی بالمعنیٰ الاعم علم بدیہی کا افادہ نہیں کرتی اسی لیے آئمہ کرام اسے قطعی غیر ضروری سے تعبیر فرماتے ہیں۔

(فتاویٰ حدیثیہ صفحہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

افادۂ چہارم: مسئلہ تکفیر میں بعض اعتبار سے فقہاے کرام کا طریقہ کار احتیاط والا ہے اور بعض اعتبار سے متکلّمین ائمہ ہے کوئی غیر محتاط نہیں دونوں ہی محتاط ہیں۔

حاشیہ سیالکوٹی میں ہے:

ان طريقة الفقهاء غير طريقة المتكلمين لأن الفقهاء سلكوا الطريق الاحوط كيلا يقع المسلم فيما فيه احتمال الكفر و المتكلمين أخذوا الطريق الأسلم حيث لاينسبون الكفر الي أحد.

(حاشیہ سیالکوٹی علی الدوانی صفحہ 106)

افادۂ پنجم: فقہاے کرام کے ہاں قطعی بالمعنیٰ الاعم فقہی حقیقت میں ظنی بالمعنیٰ الاعم ہی ہے لیکن علم طمانیت کے افادہ کرنے کی بنا پر اسے قطعی کہتے ہیں اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ قطعی بالمعنیٰ الاعم اور ظنی بالمعنیٰ الاعم میں کوئی منافات نہیں کما فی فواتح الرحموت۔

(ملخص از فتاویٰ رضویہ متفرق مقامات وکتب اصول فقہ وکلام)

فاحفظ تحفظ وتحظى من الرشد باوفى حظ ۔

(اسے یاد رکھو گے تو محفوظ رہو گے اور ہدایت سے بھر پور حصہ پاؤ گے۔)

******

فکر امروز

صحافت کا زوال یا ترجیحات کا بحران؟

شمس آغاز ، ایڈیٹر دی کوریج

موجودہ دور میں جب دنیا تیزی سے اطلاعاتی انقلاب کے زیر اثر بدل رہی ہے، میڈیا کا کردار پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو چکا ہے۔ میڈیا نہ صرف معلومات کی ترسیل کا ذریعہ ہے بلکہ یہ عوامی شعور کی تشکیل، رائے عامہ کی سمت متعیّن کرنے اور حکومتوں کو جواب دہ بنانے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے اسے جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ مگر جب یہی ستون کمزور ہونے لگے، یا اپنی اصل ذمہ داریوں سے انحراف کرنے لگے، تو پورا جمہوری ڈھانچہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ آج ہم ایک ایسے ہی دور سے گزر رہے ہیں جہاں میڈیا کے کردار، اس کی آزادی اور اس کی ترجیحات پر سنجیدہ سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔

حالیہ دنوں Reporters Without Borders کی جانب سے جاری ہونے والا ورلڈ پریس فریڈم انڈیکس 2026 خاص طور پر توجہ کا مرکز بنا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق بھارت کو 157 واں مقام حاصل ہوا ہے، جو نہ صرف تشویش ناک ہے بلکہ اس بات کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ ملک میں صحافتی آزادی کو کن چیلنجز کا سامنا ہے۔ جب ہم اس درجہ بندی کا موازنہ اپنے پڑوسی ممالک سے کرتے ہیں تو صورت حال مزید واضح ہو جاتی ہے۔ نیپال 87 ویں، سری لنکا 134 ویں، بھوٹان 150 ویں، بنگلہ دیش 152 ویں اور پاکستان 153 ویں نمبر پر ہیں، جب کہ ہندوستان ان سب سے پیچھے 157 ویں مقام پر کھڑا ہے۔ یہ صرف ایک عددی فرق نہیں بلکہ ایک فکری اور عملی بحران کی علامت ہے۔

یہ سوال فطری طور پر ذہن میں آتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا واقعی ہندوستان جیسے بڑے جمہوری ملک میں میڈیا کی آزادی محدود ہو رہی ہے؟ یا یہ صرف ایک بیرونی ادارے کی رائے ہے جسے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس درجہ بندی کو یکسر مسترد کرنا مسئلے سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہوگا۔ اس کے برعکس، ہمیں اس کے اسباب کو سمجھنے اور ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے ہمیں میڈیا کی موجودہ ترجیحات کا جائزہ لینا ہوگا۔ آج کا میڈیا، خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا، بڑی حد تک سنسنی خیزی اور تنازعات پر مبنی خبروں کو ترجیح دیتا ہے۔ ٹی وی ڈیبیٹس کا انداز دیکھ لیجیے، جہاں اکثر بحث کا محور یہ ہوتا ہے کہ کس سیاست دان نے کس کے بارے میں کیا کہا، اور اس پر دوسرا فریق کیا جواب دے رہا ہے۔ ان مباحثوں میں نہ تو سنجیدہ دلائل ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلکہ یہ ایک شور شرابے کا منظر پیش کرتے ہیں، جہاں ہر کوئی اپنی آواز بلند کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں ہمارا بنیادی سوال جنم لیتا ہے: کیا میڈیا کا یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ صرف بیانات کا تبادلہ دکھائے؟ اگر ہم دیانت داری سے جواب دیں تو کہنا پڑے گا کہ بڑی حد تک ایسا ہی ہو رہا ہے۔ عوامی مسائل جیسے بے روزگاری، مہنگائی، تعلیم، صحت، کسانوں کے مسائل اور مزدوروں کی مشکلات میڈیا کی ترجیحات میں ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اگر کبھی ان موضوعات پر بات بھی ہوتی ہے تو وہ عارضی اور سطحی ہوتی ہے، جس میں نہ تو گہرائی ہوتی ہے اور نہ ہی تسلسل۔

بے روزگاری کا مسئلہ لیجیے، جو آج کے نوجوانوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ لاکھوں نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مناسب روزگار سے محروم ہیں۔ مگر میڈیا میں اس پر مستقل اور سنجیدہ بحث کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس، سیاسی

بیان بازی کو گھنٹوں نشر کیا جاتا ہے۔اسی طرح مہنگائی، جس نے عام آدمی کی زندگی کو مشکل بنا دیا ہے، میڈیا میں محض ایک وقتی خبر بن کر رہ جاتی ہے۔ نہ تو اس کے اسباب پر تفصیلی تجزیہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے حل پر کوئی بامعنی گفتگو ہوتی ہے۔

اس صورت حال کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہیں۔ سب سے اہم وجہ ریٹنگ (ٹی آر پی) کی دوڑ ہے۔ میڈیا ہاؤسز اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ کون سی خبر زیادہ دیکھی جائے گی اور کس سے زیادہ ناظرین حاصل ہوں گے۔سنسنی خیز اور تنازعہ پر مبنی خبریں ناظرین کو زیادہ متوجہ کرتی ہیں، اس لیے انھیں بار بار نشر کیا جاتا ہے۔اس عمل میں صحافت کی بنیادی اقدار قربان ہو جاتی ہیں۔

دوسری بڑی وجہ میڈیا پر بڑھتا ہوا سیاسی اور کارپوریٹ دباؤ ہے۔کئی میڈیا ادارے براہ راست یا بالواسطہ طور پر طاقتور حلقوں کے زیر اثر ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ایسے موضوعات کو اٹھانے سے گریز کرتے ہیں جو ان کے مفادات کے خلاف ہوں۔ نتیجتاً، میڈیا ایک آزاد اور خود مختار ادارہ بننے کے بجائے ایک مخصوص بیانیہ پیش کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

یہ تمام عوامل مل کر اس صورت حال کو جنم دیتے ہیں جس کا عکس ہمیں عالمی درجہ بندی میں نظر آتا ہے۔ 157واں مقام صرف عدد نہیں بلکہ ایک انتباہ ہے کہ ہمیں اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ اگر میڈیا آزاد نہیں ہوگا، یا اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے ادا نہیں کرے گا، تو جمہوریت کمزور پڑ جائے گی۔

اس کے اثرات صرف میڈیا تک محدود نہیں رہتے بلکہ پورے معاشرے پر پڑتے ہیں۔ جب عوام کو صحیح اور مکمل معلومات نہیں ملتیں تو ان کی رائے بھی متاثر ہوتی ہے۔ وہ ایسے فیصلے کرتے ہیں جو شاید مکمل معلومات کی بنیاد پر نہ ہوں۔اس طرح جمہوریت کا بنیادی اصول، یعنی باخبر عوام، کمزور ہو جاتا ہے۔

تاہم، اس تاریک منظرنامے میں کچھ مثبت پہلو بھی موجود ہیں۔ ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل میڈیا نے کسی حد تک متبادل پلیٹ فارم فراہم کیے ہیں جہاں آزاد صحافی اور شہری رپورٹرز اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں۔کئی ایسے معاملات جو مرکزی میڈیا میں جگہ نہیں پاتے، وہ سوشل میڈیا کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ مگر یہاں بھی احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ سوشل میڈیا پر غلط معلومات اور افواہوں کا پھیلاؤ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

لہٰذا، حل صرف میڈیا پر تنقید کرنے میں نہیں بلکہ ایک جامع اصلاحی عمل میں ہے۔سب سے پہلے میڈیا اداروں کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہوگا۔انھیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ان کا اصل کام عوامی مسائل کو اجاگر کرنا اور سچائی کو سامنے لانا ہے، نہ کہ صرف سنسنی خیزی پیدا کرنا۔ اس کے لیے ادارتی پالیسیوں میں تبدیلی، صحافیوں کی تربیت اور پیشہ ورانہ اصولوں کی پاسداری ضروری ہے۔

ساتھ ہی، حکومتوں کو بھی چاہیے کہ وہ میڈیا کی آزادی کا احترام کریں اور ایسے قوانین اور اقدامات سے گریز کریں جو صحافت کو محدود کرتے ہوں۔ ایک آزاد میڈیا ہی حکومت کے لیے آئینہ ثابت ہوتا ہے، جو اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور اسے بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے۔

عوام کا کردار بھی اس پورے عمل میں انتہائی اہم ہے۔ جب تک ناظرین اور قارئین سنجیدہ اور معیاری صحافت کو ترجیح نہیں دیں گے، تب تک میڈیا بھی اپنی ترجیحات تبدیل نہیں کرے گا۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم کیا دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں: سنسنی خیز بیانات یا حقیقی مسائل پر مبنی تجزیہ؟۔

ہندوستان کی 157ویں درجہ بندی کو ایک موقع کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ایک ایسا موقع جو ہمیں اپنی غلطیوں کو سمجھنے اور انھیں درست کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم اس انتباہ کو سنجیدگی سے لیں اور اپنی ترجیحات کو درست کریں، تو ہم نہ صرف اپنی درجہ بندی کو بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ ایک مضبوط، باخبر اور متوازن جمہوری معاشرہ بھی تشکیل دے سکتے ہیں۔

یہ وقت خود احتسابی کا ہے۔ یہ وقت یہ طے کرنے کا ہے کہ میڈیا کا اصل کردار کیا ہونا چاہیے۔ کیا وہ صرف بیانات کی جنگ دکھانے والا ایک پلیٹ فارم ہوگا، یا عوام کی آواز بن کر ان کے مسائل کو دنیا کے سامنے لائے گا؟ اس سوال کا جواب ہی ہمارے مستقبل کی سمت متعین کرے گا۔ ■■■

شعاعیں

احکام طلاق میں عرف دیار کا اعتبار

”سور جاپوری جملہ ”چھوڑے دینو“ (چھوڑ دیا) کا ایک تحقیقی وفقہی مطالعہ“

از: مفتی محمد سبطین رضا مرتضوی
ایڈیٹر سہ ماہی صدائے مناظر اہلسنت، دھامی گچھ، سوناپور اتر دیناج پور، بنگال

اصول افتا میں ”عرف وعادت“ کو ایک کلیدی اور بنیادی مدرک حکم کی حیثیت حاصل ہے۔ فقہ اسلامی کا یہ حسن ہے کہ اس کے احکام جمود الفاظ کے اسیر نہیں ہیں، بلکہ وہ انسانی معاشرے کی لغوی تعبیرات، علاقائی زبانوں کے مزاج اور زمان و مکان کے تغیرات کے ساتھ پوری لچک اور وسعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ائمۂ احناف، خصوصاً متأخرین فقہاے کرام نے اس بات پر غایت درجے زور دیا ہے کہ نصوص شرعیہ کے علاوہ جو اجتہادی مسائل عرف پر مبنی ہیں، وہ عرف کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں؛ اور جن مسائل میں شریعت نے عرف کو مدار حکم قرار دیا ہے، ان میں کسی بھی عاقد یا متکلّم کے کلام کا فیصلہ لغت عرب کے متروک معانی یا کسی دوسرے شہر کے رواج پر نہیں، بلکہ اس کے اپنے دیار کی لغت، عرف اور فہم عام کے مطابق کیا جائے گا۔

تاہم معاصر دور میں بعض مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض اہل افتا عرف پر مبنی مسائل میں معاصر عرف کی تحقیق کے بجائے، کتب فقہ میں مذکور سابقہ عرف پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ طرز عمل ہر مسئلے میں یکساں نہیں، لیکن باب طلاق جیسے حساس مسائل میں اس کے نتائج نہایت دور رس ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ کسی لفظ کو اس کے لسانی و عرفی پس منظر سے کاٹ کر وقوع طلاق کا فیصلہ کرنا ہنستے بستے خاندانوں کو اجاڑنے اور شریعت کی روح تیسیر کے خلاف غیر ضروری مشقت کا سبب بن سکتا ہے۔

اسی تناظر میں، راقم الحروف کے پیش نظر ہمارے دیار سوناپور اور اس کے مضافات کا ایک نہایت اہم، کثیر الوقوع اور حساس لسانی مسئلہ ہے۔ اس دیار میں بولی جانے والی ”سور جاپوری زبان“ کا اپنا ایک خاص لسانی مزاج ہے۔ اس زبان میں ”چھوڑے دینو“ (چھوڑ دیا) جملہ اپنے عرفی استعمال کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فقہائے کرام نے اپنے دیار و زمانے کے عرف اور اردو محاورے کے اعتبار سے لفظ ”چھوڑ دیا“ کو صریح طلاق قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے دیار کی سور جاپوری زبان میں لفظ ”چھوڑ دیا“ کا ہم معنی جملہ ”چھوڑے دینو“ بھی بعینہٖ اسی حکم کا حامل ہے، یا ہمارے عرف خاص میں یہ جملہ طلاق کے علاوہ دیگر معانی، مثلاً وقتی ناراضگی، زجر، یا محض دست برداری وغیرہ کے لیے بھی مستعمل ہے؟ یہی اس مقالے کا بنیادی موضوع ہے۔ اس علمی ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے، اس مقالے کو درج ذیل پانچ ابواب پر مرتب کیا گیا ہے:

1۔ باب اول: حقیقت لغویہ اور حقیقت عرفیہ کے تقابل کے ذریعے یہ واضح کرتا ہے کہ جن مسائل کی بنیاد عرف پر ہو، ان میں الفاظ کا اعتبار ان کے لغوی نہیں بلکہ عرفی مفہوم کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

2۔ باب دوم: عرف خاص کی شرعی حجیت، اس کے ثبوت کے ضوابط، اور معاصر مفتی کے لیے مقامی عرف کی تحقیق کی ناگزیریت کو ائمۂ فقہ کی تصریحات کی روشنی میں مدلل کرتا ہے۔

3۔ باب سوم: یہ ثابت کرتا ہے کہ الفاظ طلاق کا صریح یا کنایہ ہونا کوئی جامد حکم نہیں، بلکہ عرف کے تغیر کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

4۔ باب چہارم: افتا و قضا میں مقامی عرف کی تحقیق کی ضرورت اور اس سے غفلت کے نتائج کو ائمۂ فقہ کی تصریحات کی

sibtainraza160@gmail.com-6297289394

روشنی میں واضح کرتا ہے۔

5۔ باب پنجم: دیار سوناپور کے عرف خاص، میدانی مشاہدات، اہل دیار کے فہم عام، اور متوقع اعتراضات کے جوابات کی روشنی میں زیر بحث مسئلے کا تطبیقی و فقہی تجزیہ پیش کرتا ہے۔

باب اول: حقیقت لغویہ و عرفیہ کا تقابل:

لسانیات اور فقہ اسلامی کا یہ ایک مسلمہ ضابطہ ہے کہ الفاظ اپنی اصل لغوی کے اعتبار سے بسا اوقات کسی ایک معنی کے لیے مقرر ہوتے ہیں، لیکن جب وہ انسانی معاشرے کی روز مرہ کی بول چال اور تمدنی استعمال کی بھٹی سے گزرتے ہیں، تو ان کا رخ کسی دوسرے معنی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ عند التکلم، جن مسائل میں شرع نے عرف کو مدار حکم قرار دیا ہے، وہاں الفاظ کو ان کے رائج و متعارف عرفی معنی پر محمول کیا جاتا ہے۔

کبھی لغت میں ایک لفظ طلاق کے معنی کے لیے وضع کیا گیا ہوتا ہے؛ لیکن جب کسی خاص علاقے کے عرف کو دیکھا جائے تو وہاں اس لفظ کو طلاق شرعی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اسے محض غصے کا اظہار، ڈانٹ ڈپٹ، اور زجر محض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کا طلاق سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس کے برعکس بھی ہوتا ہے کہ لغت میں ایک لفظ محض زجر کے لیے ہو، مگر عرف نے اسے طلاق بنا دیا ہو۔

اسی طرح کبھی لغت کے اعتبار سے کسی جملے کے معنی عقد لازم (ایسا معاملہ جس کا پورا کرنا شرعاً و قانوناً لازمی ہو) کے ہوتے ہیں، لیکن لوگوں کے عرف اور بول چال کے انداز میں اس سے محض وعدہ مراد لیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح کبھی کسی لفظ کے لغوی معنی بیع اور معاوضہ (خرید و فروخت) کے ہوتے ہیں؛ مگر عرف عام میں جب وہ لفظ بولا جائے تو اس سے ہبہ (کسی کو بلا عوض تحفہ دینا) مراد ہوتا ہے۔ اس اصول کو علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

وَالتَّحْقِيقُ أَنَّ لَفْظَ الْوَاقِفِ، وَالْمُوصِي وَالْحَالِفِ، وَالنَّاذِرِ وَكُلِّ عَاقِدٍ، يُحْمَلُ عَلَى عَادَتِهِ وَلُغَتِهِ الَّتِي يَتَكَلَّمُ بِهَا"۔

ترجمہ: اور حقیقت امر یہ ہے کہ وقف کرنے والے، وصیت کرنے والے، قسم کھانے والے، نذر ماننے والے اور ہر عقد کرنے والے کے لفظ کو اس کی اپنی عادت اور اس کی اپنی اس لغت (زبان) پر محمول کیا جائے گا جس کے ساتھ وہ گفتگو کرتا ہے۔

[نشر العرف، رسائل ابن عابدین، ج:2، ص:133]

علامہ شامی کے اس کلام میں لفظ "وکل عاقد" (اور ہر عقد کرنے والا) نہایت اہمیت کا حامل ہے، جس میں نکاح اور طلاق کا معاملہ کرنے والا شوہر بھی بدرجۂ اولی داخل ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ ہر متکلّم کے کلام کا اعتبار اس کی اپنی زبان، اپنے عرف اور اپنے ماحول کے مطابق ہوگا، نہ کہ کسی دوسری زبان یا دوسرے علاقے کے عرف کے مطابق۔ لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شہر یا خطے میں کوئی لفظ ایک معنی میں معروف ہو، جب کہ دوسرے شہر یا خطے میں وہی لفظ کسی اور معنی میں مستعمل ہو؛ اور شریعت مطہرہ کا اصول یہی ہے کہ جن مسائل میں عرف معتبر ہو، ان میں ہر مقام کے مقامی عرف کا اعتبار کیا جائے۔ اس سلسلے میں علامہ شامی رحمہ اللہ "رد المحتار" میں ائمۂ احناف کا ایک نہایت لطیف جزئیہ نقل فرماتے ہیں، جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے کہ احکام میں صرف عرف عرب ہی نہیں، بلکہ ہر علاقے کے مقامی عرف کا اعتبار ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"إِنَّ قَوْلَهُمْ بِاعْتِبَارِ الْعُرْفِ فِي الْأَيْمَانِ، لَيْسَ الْمُرَادُ بِهِ عُرْفَ الْعَرَبِ؛ بَلْ أَيُّ عُرْفٍ كَانَ فِي أَيِّ بَلَدٍ كَانَ وَفِي الْبَحْرِ عَنْ الْمُحِيطِ وَفِي الْأَيْمَانِ يُعْتَبَرُ الْعُرْفُ فِي كُلِّ مَوْضِعٍ حَتَّى قَالُوا : لَوْ كَانَ الْحَالِفُ خَوَارِزْمِيًّا، فَأَكَلَ لَحْمَ السَّمَكِ يَحْنَثُ؛ لِأَنَّهُمْ يُسَمُّونَهُ لَحْمًا۔"

ترجمہ: فقہائے کرام کا یہ فرمانا کہ قسموں میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا، اس سے مراد صرف عربوں کا عرف نہیں ہے؛ بلکہ کوئی بھی عرف ہو، کسی بھی شہر کا ہو (وہ معتبر ہے)۔ اور کتاب

"البحر الرائق" میں "المحیط" کے حوالے سے منقول ہے کہ قسموں میں ہر جگہ کے مقامی عرف کا اعتبار ہوگا۔ یہاں تک کہ فقہاء نے فرمایا: اگر قسم کھانے والا شخص "خوارزم" (ایک عجمی علاقہ) کا رہنے والا ہو، اور وہ قسم کھائے کہ "میں گوشت نہیں کھاؤں گا"، پھر وہ مچھلی کا گوشت کھا لے، تو وہ اپنی قسم میں سچا نہیں رہے گا بلکہ حانث ہو جائے گا؛ کیوں کہ خوارزم کے رہنے والے اپنی زبان میں مچھلی کو بھی (عام) گوشت ہی کہتے ہیں (اگرچہ لغت عرب یا دیگر عرف میں مچھلی گوشت مطلق میں داخل نہیں ہوتی)۔[رد المحتار علی الدر المختار، ج:3، ص:733، باب الیمین فی الاکل والشرب واللبس]

غور کریں! جب خوارزم کے باشندے کے لیے حکم اس کی اپنی زبان کے عرف پر لگایا گیا، تو اسی طرح اگر ہمارے دیار سوناپور اور اس کے اطراف کا کوئی باشندہ اپنی سورجاپوری زبان میں "می توک چھوڑے دینو" (میں نے تجھے چھوڑ دیا) کہتا ہے، تو اس جملے کا شرعی حکم دریافت کرنے کے لیے ہمیں نہ تو لغت عرب کی صراحت کام دے گی اور نہ ہی دہلی و لکھنؤ کے اردو عرف کی؛ بلکہ یہاں مسئلہ چوں کہ عرف پر مبنی ہے، اس لیے سوناپور کے مقامی عرف اور اہل زبان کے استعمال کا اعتبار ہوگا کہ آیا یہ جملہ طلاق ہی کے معنی میں مستعمل ہے یا کسی دوسرے معنی میں بھی؟۔

باب دوم: عرف خاص کا اعتبار:

گزشتہ باب میں یہ واضح کیا جا چکا کہ شریعت اسلامی میں عرف کو ایک معتبر دلیل اور مدرکِ حکم کی حیثیت حاصل ہے۔ اب یہاں یہ دیکھنا مقصود ہے کہ کسی عرف کو شرعاً معتبر قرار دینے کے لیے کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، اور ایک مفتی کے لیے عرف کی تحقیق کی حدود کیا ہیں۔ چنانچہ کسی معاملے کو "عرفی" قرار دینے کے لیے فقہائے کرام نے سخت شرائط عائد کی ہیں۔ کوئی بھی عادت یا بول چال اس وقت تک عرفی حکم کا درجہ نہیں پا سکتی جب تک کہ اس میں اطراد یا غلبہ متحقق نہ ہو جائے۔ اگر کسی علاقے کے چند افراد یا کسی مخصوص طبقے نے وقتی طور پر کوئی اصطلاح اختیار کر لی، یا کسی لفظ کے معنی بدل دیے، تو اسے شرعی عرف عام یا عرف بلاد نہیں کہا جائے گا۔ غلبے کا معیار یہ ہے کہ اس دیار کے عام لوگ جب اس لفظ کو مطلق بولیں، تو بلا کسی قرینے کے سب کے ذہن اسی ایک معنی کی طرف جائیں۔

یہاں ایک نہایت اہم اور اصولی پہلو کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے جس میں اکثر معاصر اہل افتا مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب کسی مفتی کے پاس طلاق یا دیگر معاملات کا کوئی ایسا مسئلہ آتا ہے جس کے کسی لفظ کو کتب فقہ (مثلاً فتاویٰ ہندیہ، فتاویٰ رضویہ، بہار شریعت وغیرہ) میں "عرف عام کی بنا پر صریح" لکھا گیا ہو، تو وہ مفتی اپنے زمانے، اپنے دیار اور اپنی زبان کے عرف کی تحقیق کیے بغیر، محض کتابی شہرت پر تکیہ کرتے ہوئے وقوع طلاق کا فتویٰ جاری کر دیتا ہے۔ یہ طریقہ کار اصول افتا اور روح فقہ کے سراسر منافی ہے۔

کتب فقہ میں کسی حکم کا عرف کی بنیاد پر مذکور ہونا، اس بات کی دلیل تو ہے کہ وہ حکم اپنے دور تصنیف اور مخصوص خطے میں معتبر تھا، لیکن کیا وہ ہمارے زمانے، ہماری زبان یا ہمارے مخصوص دیار کے لیے بھی حجت بن سکتا ہے؟۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے معروف محقق شیخ محمد فہمی ابوسنہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب "العرف والعادۃ فی رأی الفقہاء" میں لکھتے ہیں:

وَالْغَلَبَةُ وَالِاطِّرَادُ إِنَّمَا يُعْتَبَرَانِ إِذَا وُجِدَا عِنْدَ أَهْلِ الْعُرْفِ مِنَ الْبِلَادِ أَوِ الطَّوَائِفِ، أَمَّا الشُّهْرَةُ فِي كُتُبِ الْفِقْهِ، فَلَا عِبْرَةَ بِهَا، حَتَّى لَوْ وَرَدَ عَلَى الْمُفْتِي مَنْ يَسْتَفْتِيهِ فِي وَاقِعَةٍ عُرْفِيَّةٍ، كَانَ عَلَيْهِ أَنْ يَنْظُرَ فِي عَوَائِدِ بَلَدِهِ، فَيَبْنِيَ حُكْمَهُ عَلَيْهَا، لَا عَلَى مَا اشْتَهَرَ فِي كُتُبِ الْمَذَاهِبِ"- [العرف والعادة في رأي الفقهاء، ص : 56 ، المقال الثالث]

ترجمہ: اور غلبہ و اطراد کا اعتبار صرف اسی وقت ہوگا جب وہ شہروں یا گروہوں کے اہل عرف کے ہاں (حقیقتاً) پائے جائیں۔ رہی بات کتب فقہ میں کسی حکم کی شہرت کی، تو (معاصر عرف کے مقابلے میں) اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر مفتی کے پاس کوئی ایسا سائل آئے جو کسی عرفی واقعے کے بارے میں فتویٰ

مانگے، تو مفتی پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے شہر اور علاقے کی عادات و عرف کو دیکھے، اور اپنے حکم کی بنیاد ان معاصر عادات پر رکھے، نہ کہ ان باتوں پر جو مذاہب فقہ کی کتابوں میں مشہور ہو چکی ہیں۔

آگے وہ امام شہاب الدین القرافی مالکی رحمہ اللہ کی کتاب "الاحکام فی تمییز الفتاویٰ عن الاحکام" کے حوالے سے اس اطراد کی مزید گہری تفہیم پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَلَا يَكْفِي فِي الِاشْتِهَارِ كَوْنُ الْمُفْتِي يَعْتَقِدُ ذَلِكَ، فَإِنَّ ذَلِكَ نَشَأَ مِنْ قِرَاءَةِ الْمَذْهَبِ وَدِرَاسَتِهِ وَالْمُنَاظَرَةِ عَنْهُ بَلِ الِاشْتِهَارُ أَنْ يَكُونَ أَهْلُ ذَلِكَ الْمِصْرِ لَا يَفْهَمُونَ عِنْدَ الْإِطْلَاقِ إِلَّا ذَلِكَ الْمَعْنَى"۔

[العرف والعادة، ص: ٥٦، نقلاً عن الإحكام للقرافي]

ترجمہ: اور عرف کے مشہور ہونے میں یہ بات کافی نہیں ہے کہ خود مفتی (اپنے ذہن میں) اس معنی کا معتقد ہو؛ کیونکہ مفتی کا یہ عقیدہ تو محض اپنے فقہی مذہب کی کتابیں پڑھنے، ان کا درس دینے اور ان پر مناظرے کرنے سے پیدا ہوا ہے (نہ کہ حقیقی معاشرے کو دیکھنے سے)۔ بلکہ حقیقی شہرت عرفیہ یہ ہے کہ اس شہر کے عام لوگ جب اس لفظ کو مطلق بولیں، تو اس سے اس ایک خاص معنی کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہی نہ ہوں۔

بلکہ فقہاے احناف نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی عرف حادث (نیا عرف) ائمۂ متقدمین کے زمانے کے عرف پر مبنی ظاہر الروایہ کے خلاف بھی ہو، تو اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ چنانچہ خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ اپنی رسالۂ جلیلہ نشر العرف میں اس اصول کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

"إِذَا خَالَفَ الْعُرْفُ مَا هُوَ ظَاهِرُ الرِّوَايَةِ فَنَقُولُ: اعْلَمْ أَنَّ الْمَسَائِلَ الْفِقْهِيَّةَ إِمَّا أَنْ تَكُونَ ثَابِتَةً بِصَرِيحِ النَّصِّ، وَهِيَ الْفَصْلُ الْأَوَّلُ، وَإِمَّا أَنْ تَكُونَ ثَابِتَةً بِضَرْبِ اجْتِهَادٍ وَرَأْيٍ، وَكَثِيرٌ مِنْهَا مَا يَبْنِيهِ الْمُجْتَهِدُ عَلَى مَا كَانَ فِي عُرْفِ زَمَانِهِ؛ بِحَيْثُ لَوْ كَانَ فِي زَمَانِ الْعُرْفِ الْحَادِثِ لَقَالَ بِخِلَافِ مَا قَالَهُ أَوَّلًا؛ وَلِهَذَا قَالُوا فِي شُرُوطِ الِاجْتِهَادِ أَنَّهُ لَا بُدَّ فِيهِ مِنْ مَعْرِفَةِ عَادَاتِ النَّاسِ، فَكَثِيرٌ مِنَ الْأَحْكَامِ تَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ الزَّمَانِ لِتَغَيُّرِ عُرْفِ أَهْلِهِ، أَوْ لِحُدُوثِ ضَرُورَةٍ، أَوْ فَسَادِ أَهْلِ الزَّمَانِ بِحَيْثُ لَوْ بَقِيَ الْحُكْمُ عَلَى مَا كَانَ عَلَيْهِ أَوَّلًا لَلَزِمَ مِنْهُ الْمَشَقَّةُ وَالضَّرَرُ بِالنَّاسِ وَلَخَالَفَ قَوَاعِدَ الشَّرِيعَةِ الْمَبْنِيَّةِ عَلَى التَّخْفِيفِ وَالتَّيْسِيرِ... وَلِهَذَا تَرَى مَشَائِخَ الْمَذْهَبِ خَالَفُوا مَا نَصَّ عَلَيْهِ الْمُجْتَهِدُ فِي مَوَاضِعَ كَثِيرَةٍ، بَنَاهَا عَلَى مَا كَانَ فِي زَمَنِهِ لِعِلْمِهِمْ بِأَنَّهُ لَوْ كَانَ فِي زَمَنِهِمْ، لَقَالَ بِمَا قَالُوا بِهِ أَخْذًا مِنْ قَوَاعِدِ مَذْهَبِهِ-"

[نشر العرف، رسائل ابن عابدین، ج:2، ص:125]

ترجمہ: جب عرف ظاہر روایت کے مخالف ہو جائے تو ہم کہتے ہیں: جان لو کہ فقہی مسائل کی دو قسمیں ہیں؛ یا تو وہ صریح نص (قرآن و حدیث) سے ثابت ہوتے ہیں، یا پھر وہ اجتہاد اور راے سے ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان اجتہادی مسائل میں سے کثیر تعداد ایسی ہے جس کی بنیاد مجتہد (امام) نے اپنے زمانے کے عرف پر رکھی تھی؛ اس طرح پر کہ اگر وہ امام اس نئے پیدا ہونے والے عرف کے زمانے میں ہوتے، تو یقیناً اپنے پہلے قول کے خلاف فرماتے۔ اسی لیے فقہا نے اجتہاد کی شروط میں یہ بات لکھی ہے کہ مجتہد کے لیے "لوگوں کی عادات و عرف کا جاننا" ناگزیر ہے۔ پس بہت سے احکام زمانے کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں، کیوں کہ لوگوں کا عرف بدل جاتا ہے، یا کوئی نئی ضرورت پیش آجاتی ہے، یا لوگوں کے احوال میں بگاڑ آجاتا ہے۔ اگر ان مسائل میں حکم کو اسی پرانی حالت پر باقی رکھا جائے جو پہلے تھی، تو لوگوں کے لیے سخت مشقت اور نقصان لازم آئے گا، اور یہ شریعت کے ان قواعد کے خلاف ہوگا جن کی بنیاد آسانی پیدا کرنے اور نقصان کو دور کرنے پر ہے۔ اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ مشائخ مذہب (متاخرین احناف) نے بہت سے مقامات پر امام مجتہد کی نصوص کی مخالفت کی، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ اگر امام ان کے دور میں ہوتے تو اپنی

ہی قواعد مذہب کی روشنی میں وہی فرماتے جو انہوں نے فرمایا۔

بعض حضرات یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ "عرف عام" (جو پوری دنیا یا پورے ملک میں رائج ہو) تو ظاہر روایت کو چھوڑنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے، لیکن "عرف خاص" (جو کسی ایک مخصوص دیار، شہر یا زبان مثلاً سورجاپوری لغت کے ساتھ خاص ہو) ظاہر روایت یا کتب فقہ کی صراحت کے مقابلے میں معتبر نہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس شبہے کا دندان شکن جواب دیا ہے اور صراحت فرمائی ہے کہ عرف پر مبنی فقہی مسائل میں عرف عام کی طرح عرف خاص بھی پوری طرح معتبر اور نافذ العمل ہے؛ فرق صرف یہ ہوگا کہ عرف عام سے حکم عام ثابت ہوگا اور عرف خاص سے اسی علاقے کا حکم خاص ثابت ہوگا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"فَإِنْ قُلْتَ: إِذَا كَانَ عَلَى الْمُفْتِي اتِّبَاعُ الْعُرْفِ، وَإِنْ خَالَفَ الْمَنْصُوصَ عَلَيْهِ فِي كُتُبِ ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ، فَهَلْ هُنَا فَرْقٌ بَيْنَ الْعُرْفِ الْعَامِّ وَالْعُرْفِ الْخَاصِّ كَمَا فِي الْقِسْمِ الْأَوَّلِ وَهُوَ مَا خَالَفَ فِيهِ الْعُرْفُ النَّصَّ الشَّرْعِيَّ؟ قُلْتُ: لَا فَرْقَ بَيْنَهُمَا هُنَا إِلَّا مِنْ جِهَةِ أَنَّ الْعُرْفَ الْعَامَّ يَثْبُتُ بِهِ الْحُكْمُ الْعَامُّ، وَالْعُرْفَ الْخَاصَّ يَثْبُتُ بِهِ الْحُكْمُ الْخَاصُّ- وَحَاصِلُهُ أَنَّ حُكْمَ الْعُرْفِ يَثْبُتُ عَلَى أَهْلِهِ عَامًّا أَوْ خَاصًّا... وَلِهَذَا قَالَ الْعَلَّامَةُ السَّيِّدُ الْحَمَوِيُّ فِي حَاشِيَتِهِ عَلَى الْأَشْبَاهِ مَا نَصُّهُ: قَوْلُهُ: الْحُكْمُ الْعَامُّ لَا يَثْبُتُ بِالْعُرْفِ الْخَاصِّ يُفْهَمُ مِنْهُ أَنَّ الْحُكْمَ الْخَاصَّ يَثْبُتُ بِالْعُرْفِ الْخَاصِّ"-[نشر العرف، ج:2، ص:131/ 132]

ترجمہ: اگر تم یہ اعتراض کرو کہ جب مفتی پر عرف کی اتباع لازم ہے، اگرچہ وہ کتب ظاہر روایت کے منصوص مسائل کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تو کیا یہاں عرف عام اور عرف خاص میں کوئی فرق ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ: یہاں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، سوائے اس بات کے کہ عرف عام سے حکم عام ثابت ہوتا ہے اور عرف خاص سے حکم خاص۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عرف کا حکم اس کے اہل عرف پر ہی نافذ ہوگا، چاہے وہ عام ہوں یا خاص۔ اسی لیے علامہ سید حموی نے "الاشباہ والنظائر" پر اپنے حاشیے میں صراحت کی ہے کہ: مصنف کا یہ کہنا کہ حکم عام عرف خاص سے ثابت نہیں ہوتا اس سے واضح مفہوم نکلتا ہے کہ حکم خاص تو عرف خاص سے ثابت ہوتا ہے۔ علامہ شامی اس مسئلے کی مزید تاکید کرتے ہوئے ان تمام شکوک کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں جو عرف خاص کے حادث (جدید) ہونے یا کتابی نصوص کے خلاف ہونے پر اٹھائے جاتے ہیں:

"وَبِمَا قَرَّرْنَاهُ تَبَيَّنَ لَكَ أَنَّ مَا تَقَدَّمَ عَنِ "الْأَشْبَاهِ" مِنْ أَنَّ الْمَذْهَبَ عَدَمُ اعْتِبَارِ الْعُرْفِ الْخَاصِّ، إِنَّمَا هُوَ فِيمَا إِذَا عَارَضَ النَّصَّ الشَّرْعِيَّ، فَلَا يُتْرَكُ بِهِ الْقِيَاسُ، وَلَا يُخَصُّ بِهِ الْأَثَرُ... وَأَمَّا الْعُرْفُ الْخَاصُّ إِذَا عَارَضَ النَّصَّ الْمَذْهَبِيَّ الْمَنْقُولَ عَنْ صَاحِبِ الْمَذْهَبِ، فَهُوَ مُعْتَبَرٌ، كَمَا مَشَى عَلَيْهِ أَصْحَابُ الْمُتُونِ وَالشُّرُوحِ، وَالْفَتَاوَى فِي الْفُرُوعِ الَّتِي ذَكَرْنَاهَا وَغَيْرِهَا، وَشَمَلَ الْعُرْفَ الْخَاصَّ الْقَدِيمَ وَالْحَادِثَ كَالْعُرْفِ الْعَامِّ، وَبِمَا قَرَّرْنَاهُ أَيْضًا اتَّضَحَ لَكَ مَعْنَى مَا قَالَهُ فِي الْقُنْيَةِ: "مِنْ أَنَّهُ لَيْسَ لِلْمُفْتِي وَلَا لِلْقَاضِي أَنْ يَحْكُمَا بِظَاهِرِ الرِّوَايَةِ، وَيَتْرُكَا الْعُرْفَ"-[نشر العرف، ج:2، ص:133/ 134]

ترجمہ: اور ہماری اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کتاب "الاشباہ" سے جو یہ منقول ہے کہ مذہب میں عرف خاص کا اعتبار نہیں، وہ صرف اس صورت میں ہے جب عرف خاص نص شرعی (قرآن و سنت) کے معارض ہو جائے... لیکن جب عرف خاص صاحب مذہب (امام) سے منقول فقہی نص کے معارض ہو، تو وہ عرف خاص پوری طرح معتبر ہے؛ جیسا کہ متون، شروح اور فتاویٰ کے مصنفین نے فقہی فروع میں اس پر عمل کیا ہے۔ اور اس عرف خاص میں قدیم اور حادث (نیا عرف) دونوں برابر شامل ہیں جیسے عرف عام میں شامل ہوتے ہیں۔ اور اسی سے کتاب "القنیہ" کی اس عبارت کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ: مفتی اور قاضی کے لیے یہ جائز ہی نہیں ہے کہ وہ ظاہر روایت کو پکڑ کر بیٹھ جائیں اور (لوگوں کے معاصر) عرف کو چھوڑ دیں۔

علامہ شامی نے کتب مذہب کے اقوال پر عرف خاص کو ترجیح دینے کی درجنوں مثالیں پیش کرنے کے بعد، اس پوری ابحاث کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"فَهَذِهِ النُّقُولُ وَغَيْرُهَا دَالَّةٌ عَلَى اعْتِبَارِ الْعُرْفِ الْخَاصِّ وَإِنْ خَالَفَ الْمَنْصُوصَ عَلَيْهِ فِي كُتُبِ الْمَذْهَبِ مَالَمْ يُخَالِفِ النَّصَّ الشَّرْعِيَّ"۔ [نشر العرف، ج:2، ص:133]

ترجمہ: پس یہ تمام منقولہ عبارات اور ان کے علاوہ دیگر دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عرف خاص کا پورا اعتبار کیا جائے گا، اگرچہ وہ کتب مذہب میں منصوص (لکھے ہوئے) مسائل کے سراسر خلاف ہی کیوں نہ ہو، جب تک کہ وہ نص شرعی (قرآن وحدیث) کے خلاف نہ ہو۔

باب سوم: عرف کی تبدیلی سے الفاظ طلاق کا صریح اور کنایہ ہونا:

قسموں میں تقسیم کیا ہے: صریح اور کنایہ۔ صریح وہ الفاظ ہیں جن میں نیت کی حاجت نہیں ہوتی، جبکہ کنایہ کے احکام نیت یا قرائن پر موقوف ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی تعریف اور ان کے ضوابط پر مستقل گفتگو باب پنجم میں آئے گی۔ یہاں مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عرف کی تبدیلی سے کسی لفظ کا صریح یا کنایہ ہونا بھی بدل سکتا ہے۔

اس قاعدے کی سب سے نمایاں مثال لفظ ''سرحتک'' اور اس کا فارسی ترجمہ "رہا کردم" ہے۔ اصل لغت میں ''سرحتک'' کنایہ تھا، لیکن فارسی عرف میں "رہا کردم" صرف طلاق کے لیے مستعمل ہو گیا، جس کی بنا پر فقہائے احناف نے اسے صریح قرار دیا؛ چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ "رد المحتار" میں اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إِنَّ "سَرَحْتُكِ" كِنَايَةٌ؛ لَكِنَّهُ فِي عُرْفِ الْفُرْسِ غَلَبَ اسْتِعْمَالُهُ فِي الصَّرِيحِ، فَإِذَا قَالَ: "رَهَا كَرْدَمْ" أَيْ: سَرَحْتُكِ، قَالَ: يَقَعُ بِهِ الرَّجْعِيُّ مَعَ أَنَّ أَصْلَهُ كِنَايَةٌ أَيْضًا، وَمَا ذَاكَ إِلَّا لِأَنَّهُ غَلَبَ فِي عُرْفِ النَّاسِ اسْتِعْمَالُهُ فِي الطَّلَاقِ، وَقَدْ مَرَّ أَنَّ الصَّرِيحَ مَا لَمْ يُسْتَعْمَلْ إِلَّا فِي الطَّلَاقِ مِنْ أَيِّ لُغَةٍ كَانَتْ"۔ [رد المحتار علی الدر المختار، ج:3، ص:299، باب الکنایات]

ترجمہ: بے شک (اصل لغت میں) لفظ "سرحتک" کنایہ ہے؛ لیکن فارسی زبان والوں کے عرف میں اس کا استعمال صریح میں غالب ہو گیا ہے۔ پس جب کوئی فارسی زبان میں کہے: "رہا کردم"، تو فقہاء نے فرمایا کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہو جائے گی، باوجود یہ کہ اس کی اصل (لغت) کنایہ ہی تھی۔ اور یہ حکم کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کے عرف میں اس کا استعمال طلاق میں غالب ہو چکا ہے۔ اور یہ قاعدہ پہلے گزر چکا ہے کہ صریح وہ لفظ ہوتا ہے جو طلاق ہی کے معنی میں استعمال کیا جائے، وہ خواہ کسی بھی زبان کا لفظ ہو (جب عرف اسے طلاق کے لیے خاص کر دے تو وہ صریح بن جاتا ہے)۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی اس عبقری عبارت سے ہماری بحث کا ایک نہایت مضبوط اصولی نتیجہ سامنے آتا ہے، جس سے بطریق عکس بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ جب فقہائے کرام نے ایک ایسے لفظ کو، جو اصل لغت کے اعتبار سے کنایہ تھا، محض ایک مخصوص دیار کے عرف غالب کی بنا پر صریح قرار دے دیا، تو اسی اصول کا عکس بھی درست ہوگا۔ یعنی اگر کسی لفظ کو فقہائے کرام نے کتب فقہ میں اپنے دیار اور عرف کی بنا پر صریح شمار کیا ہو، لیکن ہمارے دیار (سوناپور و نواح) کے عرف خاص میں اس کا استعمال طلاق ہی کے لیے نہ ہو، بلکہ دوسرے معانی میں بھی رائج و مستعمل ہو، تو وہ ہمارے دیار کے اعتبار سے صریح نہیں رہے گا، بلکہ کنایہ کے حکم میں ہوگا۔

اگر اس پہلو کو قبول نہ کیا جائے تو علامہ شامی کی بیان کردہ علت کی عمومیت محل نظر رہ جاتی ہے کہ "الصریح مالم یستعمل الافی الطلاق من ای لغۃ کانت" صریح ہر زبان کا وہ لفظ ہے جو طلاق ہی کے لیے استعمال ہو۔ **(جاری)**

انوارحیات

علامہ شاہ ابراہیم رضا بریلوی اور ان کے تلامذہ

از: مولانا عابد چشتی۔ استاذ دارالعلوم صمدیہ پھپھوند شریف، ضلع اوریا

غیر منقسم ہندوستان کے وہ مبارک خانوادے جہاں سے علم و ہنر کے آبشار پھوٹے، اسلامی علوم و فنون کی سنہری قندیلیں فروزاں ہوئیں اور مذہب وملت کے فروغ کے تیئں دہائیوں پر محیط غیر معمولی علمی خدمات ہی جن کے تعارف اور شناخت کا سب سے معتبر حوالہ ٹھہرا، ان خانوادوں میں جہاں خانوادۂ فرنگی محل، خانوادۂ عثمانیہ بدایوں اور خانوادۂ خیر آباد کا نام آتا ہے وہیں خانوادۂ رضویہ بریلی شریف کا تذکرہ بھی تاریخ کے حافظے میں ایک زندہ حقیقت کی صورت میں محفوظ ہے، تقریباً تین صدیوں کے علمی تسلسل کی پاکیزہ روایات جس کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خانوادۂ رضویہ کے جد اعلیٰ جناب سعادت یار خان نے سلطنت دہلی کے ایماو حکم پر اپنی بہادری اور خداداد قوت ارادی سے بریلی کو فتح کیا، جو اس وقت شمالی یوپی کے صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا، خدا کی قدرت کی کرشمہ سازی کہ سعادت یار خان صاحب نے جس بریلی کو سیاسی اور مادی سطح پر فتح کیا تھا بعد میں آپ کی نسل سے وہ ہستیاں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جنھوں نے اسی بریلی میں علمی اور روحانی سطح پر فتح و کامرانی کے جھنڈے نصب کیے اور شمشیر و سنان کی جگہ قرطاس و قلم سے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا، اور یوں دنیوی وجاہت کے ساتھ ساتھ روحانی کشوری خانوادۂ رضویہ کی تقدیر میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگئی۔ چناں چہ:

سلسلۃ الذھب: حضرت علامہ رضا علی بریلوی قدس سرہٗ نے سب سے پہلے بساط علم و درس آراستہ کی اور علم و فن کی زلف طرح دار کی مشاطگی میں اپنی پوری عمر گزار دی، اس کے بعد آپ کے صاحب زادے مفسر قرآن حضرت علامہ نقی علی بریلوی قدس سرہٗ نے نہ صرف اس وراثت کو سنبھالا بلکہ اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیے جب کہ آپ کے بعد آپ کے صاحب زادے امام اہل سنت، مجدد ملت، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے علم و فن کے حوالے سے اس خاندانی روایت کو اس قدر فروغ دیا کہ دیکھتے دیکھتے خانوادۂ رضویہ کے روحانی سطوت و جلال اور علمی طمطراق سے عرب و عجم کی حدود گونجنے لگیں، ممدوح گرامی مفسر اعظم ہند حضرت علامہ ابراہیم رضا قادری قدس سرہٗ خانوادۂ رضویہ کے اسی سلسلۃ الذہب کی وہ حسین کڑی ہیں جنھوں نے نہ صرف علمی سطح پر اپنی شخصیت کا لوہا منوایا، بلکہ خانوادۂ رضویہ کے علمی فیضان کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے اپنے خون جگر کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا، ان کی جد و جہد، چو طرفہ تگ و دو اور پھر ملک گیر سطح پر اس کے خوشگوار نتائج کا ایک سنہری باب ہے جسے پڑھنے کے بعد فکر و قلم کی تمام تر جولانیاں ان کے حضور سجود نیاز لٹانے کے لیے مچلنے لگتی ہیں۔

ولادت: مفسر اعظم شاہ ابراہیم رضا قادری امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے نبیرۂ اکبر اور حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے بڑے صاحب زادے تھے، آپ کی ولادت 10 / ربیع الثانی 1325ھ کو شہر بریلی میں ہوئی۔ یہ وہ عہد تھا جب کہ ایک طرف آپ کے جد امجد امام اہل سنت کی تحقیقات وفتاویٰ اور ان کی خداداد صلاحیتوں کا آوازہ ملک کے گوشے گوشے میں گونج رہا تھا، قلم کی روشنائی سے عشق رسالت کے چراغ روشن ہو رہے تھے اور آپ کی شخصیت مسلک حق کا استعارہ قرار پا رہی تھی تو دوسری طرف آپ کے والد حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا قادری کی قائدانہ خدمات کی صدائے بازگشت علمی حلقوں سے لے کر عوامی سطح تک سنائی دے رہی تھی اور یوں عرب و عجم کے ایک بڑے خطے کی مذہبی

ولی رہنمائی خانوادۂ رضویہ کی قیادت پر مرتکز ہو چکی تھی۔ علم و عمل تصوف و روحانیت اور عشق و وفا کے اسی ماحول میں مفسر اعظم شاہ ابراہیم رضا کی شخصیت انفس و آفاق کی اس کائنات میں جلوہ گر ہوئی، منجھلے دادا امام زمن حضرت علامہ حسن رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے مادہ تاریخ اس مصرع اور دعا سے نکالا:

علم و عمر اقبال و طالع دے خدا۔

1325ھ

پیشین گوئی: روحانی ماحول اور عشق رسالت کی عطر بیز فضاؤں میں آپ کی پرورش و پرداخت کا خصوصی اہتمام ہوا، 1329 ہجری میں جب کہ آپ کی عمر چار سال چار ماہ اور چار دن کی ہوئی تو خاندانی روایت کے مطابق رسم بسم اللہ خوانی کی تقریب بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کی گئی جس میں خود مجدد وقت امام اہل سنت قدس سرہٗ نے علما و تلامذہ کے ساتھ ساتھ شہر کے معزز اہل ایمان کو اس تقریب میں مدعو کیا اور شفقت و کرم کے جذبات سے لبریز انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ اپنے پوتے کی رسم بسم اللہ خوانی ادا کرائی۔ مفسر اعظم قدس سرہٗ کی رسم تسمیہ خوانی کے وقت امام اہل سنت کی آنکھوں میں فرحت و انبساط کے انگنت چراغ ٹمٹما رہے تھے اور محفل میں موجود لوگ آپ کے چہرے کی بشاشت کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اللہ رب العزت نے انھیں ایک پوتے کے وجود سے نواز دیا تھا جس کے ساتھ ان کے مستقبل میں نسب کا تسلسل وابستہ ہونے والا تھا، بلکہ امام اہل سنت کی چشم بصیرت غیب کے پردے ہٹا کر اپنے پوتے کا تابناک مستقبل دیکھ چکی تھی اور انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ خانوادۂ رضویہ کے علمی و روحانی فیضان کو بہت دور تک پہنچانے کے لیے قدرت کی طرف سے اس بچے کا انتخاب کیا جا چکا ہے، اسی حقیقت کے ادراک نے امام اہل سنت کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ رسم تسمیہ خوانی کے موقع پر چار سال کی چھوٹی سی عمر ہی میں، جب کہ عام بچے شعور و آگہی کی دہلیز پر قدم تک نہیں رکھتے، امام اہل سنت نے اپنے صاحب زادے حضرت حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا قادری علیہ الرحمہ کی وکالت میں مفسر اعظم حضرت علامہ ابراہیم رضا کو ان تمام سلاسل طریقت کی اجازت و خلافت عطا فرما دی جو ان تک عظیم روحانی مشائخ سے پہنچے تھے۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ چار سال کی ننھی سی عمر خلافت جیسی عظیم روحانی امانتوں کے سپرد کرنے کی نہیں ہوتی چنانچہ وہاں موجود لوگوں کو اس بات پر انتہائی حیرت کا احساس ہوا اور ان کی متجسس نگاہیں اس استعجاب کی چغلی کھانے لگیں جو ذہن و فکر کی سطح پر سوالیہ نشان بن کر ابھر رہا تھا، امام اہل سنت کو محفل کی بے اطمینان کیفیت کا احساس ہوا تو اس سے پہلے کہ کوئی زبان، اعتراض کی بدمزگی کے ساتھ بر سر محفل کھلتی آپ نے قدرت کے غیبی فیصلے سے پردہ اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”لوگو! میرا یہ پوتا ایک دن میری زبان بنے گا“

اس جملے کے تناظر میں محفل میں موجود اہل دل کو مفسر اعظم کی حیات کا پورا منظر نامہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ ایک اشارۂ غیبی ہے یعنی رحمت خداوندی دین کی گراں مایہ خدمات کے لیے بچے کا انتخاب کر چکی ہے۔ اس پیشین گوئی سے اہل خانہ اور چاہنے والوں کے چہرے مستقبل کے حسین احساس سے دمک اٹھے۔ خیر! دنیا نے امام اہل سنت کی پیشین گوئی کو حرف بہ حرف صداقت کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے دیکھا بھی کہ مفسر اعظم نہ صرف امام اہل سنت کی زبان بنے بلکہ ان کی تہہ دار علمی اور روحانی شخصیت نے عہد رضا کی بہاروں کو نئی تازگی عطا کر دی۔

امتیاز شان: یوں تو مفسر اعظم علامہ ابراہیم رضا قدس سرہٗ مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے، وہ فقہ و ادب حدیث و تفسیر جیسے اسلامی علوم کے نکتہ شناس تھے تو ریاضی اور اقلیدس جیسے عصری علوم کے بھی غواص تھے، ایک طرف ان کی طبیعت میں قلندرانہ صفات کا رنگ تھا تو دوسری طرف سیاست و تدبر میں ان کی گہری بصیرت حیرت انگیز تھی، اگر وہ صاحب حال صوفی، بے نفس فقیہ اور دنیائے خطابت کے بے تاج بادشاہ تھے، تو ایک عظیم خانقاہ کی روحانی امانتوں کے امین بھی تھے غرض جس پہلو سے ان کی حیات کا جائزہ لیا جائے وہ اپنے وقت کی ممتاز اور نابغہ روزگار شخصیت کے روپ میں جلوہ گر نظر آتے ہیں تاہم ان کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو خانوادۂ رضویہ کے درس گاہی فیضان اور

اسلامی علوم و فنون کی ملک گیر سطح پر فروغ و اشاعت سے وابستہ ہے۔اس نقطے پر شاہ صاحب کی شخصیت فروغ علم کے مرکز و محور پر گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے، یہاں وہ علم کی زلف برہم سنوارتے ہوئے، علم کو سجوتے، علم کو نکھارتے اور علم کی اشاعت میں آبلہ پائی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس حوالے سے ان کی جدوجہد کا ارتکاز دو متوازی سمتوں میں دکھائی دیتا ہے چناں چہ ایک طرف وہ خود بساط علم آراستہ کرتے ہیں اور اپنی خداداد صلاحیت سے علم و ہنر اور اسلامی علوم فنون کے سینکڑوں پیکر تراش کر ملت کے حوالے کر تے ہیں جو بعد میں پورے ملک میں خانوادۂ رضویہ کے علمی فیضان کو عام کرنے میں انتہائی مضبوط اور قابل اعتماد وسیلہ ثابت ہوتے ہیں، جب کہ دوسری جانب عظیم دینی درسگاہ، یادگار رضا یعنی ’’منظر اسلام‘‘ کی ڈوبتی ہوئی نبض کو اپنے خون جگر سے ایک نئی زندگی عطا کرتے ہیں اور ایک بہت بڑے ممکنہ علمی خسارے سے ملت کا تحفظ فرماتے ہیں۔اصل موضوع کی طرف بڑھنے سے پہلے مقالہ نگار ضمناً منظر اسلام کے حوالے سے کچھ لب کشائی کی اجازت چاہتا ہے جس کے بغیر مفسر اعظم کی شخصیت کے علم دوست پہلو کی تفہیم ادھوری رہ جاتی ہے۔

منظر اسلام: یہ 1322 ہجری کی بات ہے جب کہ امام اہل سنت نے اسلامی علوم کی اشاعت کے لیے منظر اسلام کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جو دیکھتے دیکھتے اہل سنت کے مرکزی مدارس میں شمار کیا جانے لگا، اس میں کوئی شک نہیں کہ منظر اسلام کی ملک گیر شہرت کی وجہ جہاں اس کا مضبوط علمی نظام تھا وہیں اس کے پس پردہ امام اہل سنت کی نسبت کی جلوہ سامانیاں بھی تھیں۔چناں چہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے طالبان علوم کے قافلے بریلی کی پاک سرزمین پر فروکش ہونے لگے ، قال اللہ و قال الرسول کے دل نواز صدائیں بریلی کی فضا میں پاکیزگی کی خوشبو بکھیرنے لگیں اور منظر اسلام کے در و دیوار لاہوتی نغمات سے گونجنے لگے۔خانوادۂ رضویہ کے علمی خدمات کا یہ وہ سنہری عہد تھا جب کہ خود مفسر اعظم شاہ ابراہیم رضا قادری منظر اسلام میں اپنی علمی شخصیت کو پروان چڑھا رہے تھے اور وقت کی عظیم علمی ہستیوں کے زیر سایہ اسلامی علوم کے حصول میں منہمک تھے۔علم کی ایک کہکشاں تھی جس کی وسعتوں میں اضافہ در اضافہ کا عمل انتہائی سبک روی سے جاری تھا اور متلاشیان علم و معرفت کے قدم کشاں کشاں بریلی کی جانب کھنچے آتے تھے۔ مگر اچانک اس لہلاتے چمن پر خزاں کے بادل مڈلانے لگے، نااہلوں کے ہاتھوں داخلی اور خارجی نظام کے تانے بانے ایک ایک کر کے بکھرنے لگے ، اور ضمیر فروشوں کی نحوست اور شوریدہ سری سے منظر اسلام کی علمی شناخت غبار تشکیک میں دھندلاتی چلی گئی، نتیجۃً علم و نور کے قافلے رخت سفر باندھ کر کسی اور منزل کی تلاش میں نکل پڑے، علم و فن کے سوتے اچانک خشک ہو گئے، منظر اسلام کے در و دیوار سے وحشت ٹپکنے لگی اور اساتذۂ فن کبیدہ خاطر ہو کر یکے بعد دیگرے دوسرے آشیانوں کی تلاش میں چل دیے۔ علامہ واجد القادری علیہ الرحمہ کی زبانی منظر اسلام کی تباہی کا یہ بھیانک منظر ملاحظہ کیجیے، لکھتے ہیں:

’’بہت کچھ لٹ چکا تھا، دارالعلوم کی حالت خزاں رسیدہ چمن کے مانند ہو چکی تھی، مشاہیر علما اور کہنہ مشق اساتذۂ کرام سے دارالعلوم خالی ہو چکا تھا، ہونہار، طباع اور ذہن طلبہ بھی دوسرے مدارس کا رخ کر چکے تھے‘‘

نشأۃ ثانیہ: اس صورتحال نے خانوادۂ رضویہ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، وہ اپنے ہی مشائخ کے ہاتھوں بسائے ہوئے علم و ہنر کے شہر کو تخت و تاراج ہوتا دیکھ رہے تھے، جو ان کے لیے کسی عظیم سانحہ سے کم نہیں تھا، ایسے مایوس کن حالات میں خانوادے کی نگاہیں بار بار مفسر اعظم کی شخصیت پر جا کر ٹھہر رہی تھیں، جس نے مفسر اعظم کے اندر اضطراب کی ایک لہر پیدا کر دی، چنانچہ ان ناگفتہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ کی شخصیت آہنی حوصلوں اور ہمالیائی عزم و یقین کے ساتھ آگے آئی۔آپ نے اپنی تمام تر توانائیوں کا رخ منظر اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی طرف کر دیا ،شب و روز تگ و دو کی، در در کی خاک چھانی اور اپنا سارا سکون و آرام تج دیا۔اس درمیان مصیبتوں کے طوفان آئے مگر آپ کے مضبوط ارادوں سے ٹکرا کر اپنا رخ موڑنے پر مجبور ہو گئے۔یہاں

پہنچ کر میں اس منظر نامے میں ایک کردار اور ضم کرنے کی اجازت چاہوں گا جس کا تعلق خانقاہ رضویہ کی ان عفت مآب خواتین کے پاکیزہ جذبات سے ہے جنھوں نے کانٹوں بھرے اور صبر آزما لمحات میں حضرت مفسر اعظم کا نہ صرف مکمل ساتھ دیا بلکہ قربانیوں کی وہ داستان رقم کی جسے صرف بھیگی پلکوں کے سائے ہی میں پڑھا جا سکتا ہے۔ جذبات پر قابو رکھ کر علامہ واجد القادری علیہ الرحمہ کا یہ دل گیر بیانیہ ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں :

"ایک دو بار یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مشاہروں اور وظائف طلبہ کے لیے اہل خانہ کے زیورات اور گھر کے قیمتی اثاثے کو فروخت کرنا پڑا، لیکن اہل خانہ کی پیشانیوں پر بل تک نہیں آتا، بلکہ ایک عظیم کار خیر سمجھ کر اپنے زیورات اور اثاثہ خانہ حضور مفسر اعظم کے حوالے کر دیا کرتی تھیں"

خدا نے ان پاکیزہ جذبوں کی لاج رکھی، اخلاص و عمل کی اثر انگیزی رنگ لائی اور زمانے نے دیکھا کہ خشک سوتوں سے پھر آبشار کا شور سنائی دینے لگا، مرجھائے ہوئے پھولوں میں یقین کی للامی آئی اور علم و حکمت کی انجمن دوبارہ آراستہ ہوئی مفسر اعظم کی پیہم سعی اور انتھک قربانیوں نے پورا منظر نامہ بدل کر رکھ دیا، آپ کے سوانح نگار علامہ واجد القادری لکھتے ہیں :

سب سے پہلے قابل و محنتی اساتذہ کرام کو دارالعلوم میں یکے بعد دیگرے لانا شروع کیا ... اور خود بھی کتب متوسطات سے مطولات تک کا درس دینے لگے، جس کا مفید نتیجہ یہ سامنے آیا کہ چند ہی دنوں میں ذہین و محنتی طلبا سے دارالعلوم بھر گیا... ماضی کی یاد تازہ ہو گئی، دیکھتے دیکھتے ہزاروں طلبہ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے دارالعلوم میں آ گئے، دارالعلوم یا خانقاہ کے بالائی حصے میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ایک ایک مسجد میں دو دو تین تین طلبا نے اپنے رہنے سہنے کی گنجائش نکالی۔

مفسر اعظم مسند تدریس پر: مندرجہ بالا صفحات میں ضمناً اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ مفسر اعظم جہاں ایک طرف منظر اسلام کی آبیاری اور اس کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے تگ و دو کر رہے تھے وہیں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ ممدوح گرامی منظر اسلام کی پاکیزہ چھاؤں میں بساط درس و تدریس آراستہ کر کے طالبان علوم نبویہ کو اپنے چشمہ علم سے سیراب بھی کر رہے تھے اور یہ آپ کے درس گاہی فیضان کا غلغلہ ہی تھا کہ بر صغیر کے گوشے گوشے سے تشنگان علم کے قدم دوبارہ بریلی کا رخ کر رہے تھے ۔ آپ کی درس گاہ کیا تھی فیضان رضا کا ابلتا ہوا چشمہ ،فقہ و تفسیر حدیث و تاریخ ادب و نحو سے لے کر ریاضی اور اقلیدس تک کون سا علم کا ایسا شعبہ تھا جہاں مفسر اعظم کی علمی گہرائی اور خداداد گیرائی امام اہل سنت کی یاد تازہ نہ کر رہی ہو ، جب درسگاہ آراستہ ہوتی اور پامال سے پامال مضامین پر آپ کی فکر رسا کی کرشمہ سازی کا سماں بندھتا تو علم و حکمت کے ایسے باب کھلتے کہ طلبہ تو طلبہ ہیں سالہا سال درسگاہوں کی زینت بننے والے کہنہ مشق اساتذہ بھی اپنی مسند تدریس چھوڑ کر آپ کی درسگاہ میں بیٹھ کر گوش بر آواز ہو جاتے اور نبیرۂ اعلیٰ حضرت کی نکتہ سنجیوں پر بے خود ہو کر سر دھنتے۔ آپ کو تفسیر کے بعد عربی زبان و ادب سے خاصا شغف تھا، عربی ایسی بولتے کہ عربی النسل ہونے کا شبہ ہوتا اور جب درسگاہ میں نحو و صرف اور عربی تراکیب پر گفتگو فرماتے اور اپنے ناخن علم سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی گرہیں کھولتے تو حال یہ ہوتا کہ بقول علامہ واجد القادری کے :

"کافیہ تو ایسی پڑھاتے تھے کہ نحو کی منتہی کتابوں سے طلبہ کو بے نیاز کر دیا کرتے تھے، عربی ادب کا درس ہوتا تو اساتذۂ کرام بھی زبان کی چاشنی اور نئی تراکیب سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ کی درسگاہ میں جمع ہو جاتے"

آپ کی تفہیمی خصوصیات اور تدریسی امتیازات کے نتائج یہ ظاہر ہوئے کہ آپ کے خوان علم و فن سے خوشہ چینی کرنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی چلی گئی اور شاگردوں کی فہرست میں اضافہ ہوتا چلا گیا جس نے پورے ملک میں اسلامی علوم و فنون کے حوالے سے نہ صرف انقلاب برپا کر دیا بلکہ خانوادۂ رضویہ کے علمی فیضان کو دور دور تک متعدّی کرنے میں اہم اور تاریخی کردار ادا کیا جس کے خوشگوار نتائج سے نسل در نسل عشق رسالت، عقیدے کی پختگی اور خوش اعتقادی کی پاکیزہ فضا قائم ہوئی۔ **(جاری)**

آئینۂ وطن

بھارت میں GEN-Z جمہوری بیداری اور سی جے پی کا مستقبل

پی. اے. پریم بابو/مترجم مہتاب پیامی

جنتز منتز Gen Z کے طلبہ وطالبات کے احتجاج نے یہ ثابت کر دیا کہ آئین محض اپنے قانونی الفاظ، ہدایات یا تحریری شقوں کی وجہ سے زندہ یا کارآمد نہیں رہتا، بلکہ یہ مزاحمتی تحریکوں اور جدوجہد کے ذریعے قائم رہتا ہے۔

ایک فاشسٹ حکومت کی طرف سے قائم کردہ خوف کی دیواروں کو توڑتے ہوئے، اس پرجوش اور نوجوان مزاحمت نے کامیابی کے ساتھ ایک نئی تاریخ رقم کی۔ وہ اس پختہ یقین کے ساتھ ڈٹے رہے کہ اختلافِ رائے ان کا بنیادی حق ہے۔

وہ نوجوان بھارتی جمہوریت کی سب سے بڑی امید کی علامت ہیں۔ اس کے باوجود، اس عظیم تحریک کے اندر سی جے پی (CJP) نامی نئی سیاسی تشکیل اور اس کی قیادت کی موجودگی کا تنقیدی جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

سی جے پی نے طلبہ اور نوجوانوں کو درپیش شدید بے روزگاری اور اسکول سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے تعلیمی بحران کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی کوشش کی ہے، جس نے گزشتہ دس سالوں سے نوجوانوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر رکھا ہے۔

تاہم، ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جنتز منتز پر دیکھا جانے والا بے مثال جمہوری سیاسی ابھار بنیادی طور پر Gen-Z کی خوف سے آزاد انقلابی مزاحمت کا اظہار تھا۔

نریندر مودی کی سیاسی امیج کو پہنچنے والے نقصانات کا ابھی پوری طرح سے اندازہ نہیں لگایا جا سکا ہے؛ اسی تناظر میں Gen-Z کی ہمت اور جمہوری شعور کو تاریخ میں درج کیا جائے گا۔

یہ تحریک بائیں بازو (Left)، دلت، مسلم اور سیکولر جمہوری قوتوں کی مسلسل جدوجہد، مداخلتوں اور کوششوں کا نتیجہ بھی ہے۔ تاریخ میں اس طرح کی تحریکیں پہلے بھی چلی ہیں۔ کئی احتجاج کسی مرکزی قیادت کے بغیر بھی ابھرے ہیں، جو کہ سماجی شعور اور زندگی کی جدوجہد سے پیدا ہوئے تھے۔

مثلاً 1919ء کا بیجنگ احتجاج، 1974ء میں جے پرکاش نارائن کی قیادت میں چلنے والی تحریک، اور وال اسٹریٹ، چیکوسلاواکیہ، پیرس، تیانمن اسکوائر، آسام اور دیگر جگہوں پر ہونے والے مختلف احتجاجات شامل ہیں، جن میں سے کچھ کامیاب رہے اور کچھ ناکام۔

ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ کس طرح ہانگ کانگ (2019ء) اور تیانمن اسکوائر (1989ء) میں احتجاج کو خود کو "کمیونسٹ" کہنے والی آمرانہ حکومتوں نے بے دردی سے کچل دیا، یہاں تک کہ انھیں ٹینکوں تلے روند دیا گیا۔

اس کے برعکس، ہندوتوا فاشسٹ بھارت میں نوجوانوں کی اس بیداری کی کامیابی ایک ایسی چیز ہے جو گہرے تجزیے کی متقاضی ہے۔ نوجوانوں نے نہ صرف مودی، شاہ اور ہندوتوا طاقتوں کے پھیلائے ہوئے خوف کو چکنا چور کیا، بلکہ اگر یہ تحریک جاری رہے تو یہ ان کے سیاسی عروج کو غیر متوقع نقصان پہنچا سکتی ہے۔

سی جے پی 2011ء میں عام آدمی پارٹی (AAP) کے ابھار کے ماڈل پر ہی سامنے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر وہی نظریہ ایک نئے انداز میں پیش کرتی ہے۔

سی جے پی کے بانی رہنما ابھیجیت دیپکے، دیگر اہم

شخصیات کے ساتھ، پہلے عام آدمی پارٹی کے متحرک ارکان اور نمایاں چہرہ رہ چکے ہیں۔ جب دہلی میں عام آدمی پارٹی کی حکومت تھی، تو وہ دہلی حکومت میں مواصلاتی مشیر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے، اور عام آدمی پارٹی کے زوال کے بعد انھوں نے یہ عہدہ چھوڑ دیا۔

اصل میں سی جے پی کوئی خود رو سیاسی ابھار نہیں ہے، بلکہ یہ عام آدمی پارٹی (AAP) کی ناکامی کا نتیجہ ہے، جو شراب کی پالیسی میں کرپشن، ہندوتوا نظریے کا بوجھ اٹھانے کی آمادگی، ایودھیا مندر منصوبے کے جواز، دکھاوے کی مندر سیاست، اور تحفظات (Reservation) پر اس کے دوہرے معیار کی وجہ سے پیش آئی۔ اس کے جوہر میں نظریات کی شدید کمی ہے۔

اب ہم سی جے پی کے روپ میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ صرف ایک دھندلی پڑتی ہوئی سیاسی طاقت کو دوبارہ نئے روپ میں پیش کرنے اور زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ جیسے جیسے کیجریوال اور عام آدمی پارٹی کے دیگر رہنما اپنی چمک اور ساکھ کھو رہے ہیں، یہ "نئی" تشکیل بنجر زمین میں تازہ بیج بونے کی کوشش کر رہی ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان نام نہاد نوجوان سی جے پی رہنماؤں نے کیجریوال کے سیاسی نقطۂ نظر کو نہ تو چیلنج کیا ہے اور نہ ہی مسترد کیا ہے۔ ان کی خاموشی غیر جانب داری نہیں بلکہ ملی بھگت ہے۔ ماضی سے الگ راستہ اختیار کرنے کے بجائے، سی جے پی انھی تضادات کا تسلسل ہے، جسے ایک نئے جوان چہرے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سی جے پی کے موجودہ رہنما نے ماضی میں راہل گاندھی کا اسی طرح مذاق اڑایا تھا اور ان پر تنقید کی تھی جیسے کبھی کیجریوال کرتے تھے۔ عام آدمی پارٹی کے سیاسی سفر کے آغاز اور سی جے پی کے درمیان واضح مشابہت موجود ہے۔

اگر ہم اس عمومی طریقے کا جائزہ لیں جو سی جے پی نے جدوجہد کے آغاز میں اپنایا تھا، تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

بدعنوانی کا کوئی اسکینڈل یا بے ضابطگی سامنے آتی ہے جو قومی توجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے بعد نوجوانوں اور طلبہ کی قیادت میں احتجاج شروع ہوتا ہے۔ جلد ہی، گاندھی جی کی طرح کی قربانی اور وقف کے نام پر، ایک فرد (اس معاملے میں سونم وانگچک) بھوک ہڑتال کے ساتھ آگے آتا ہے۔

2011ء میں انا ہزارے کا ابھار بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ سونم وانگچک میں ہم بنیادی طور پر انا ہزارے کا ایک نیا روپ دیکھتے ہیں۔ اگر ہم اس طریقہ کار کا تنقیدی جائزہ لیں جو سی جے پی نے جدوجہد کے بالکل شروع میں پیش کیا تھا، تو اس کا سیاسی سکرپٹ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

یہاں جس بات پر ہمیں توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ انا ہزارے، اروند کیجریوال اور سونم وانگچک کے درمیان ایک کارپوریٹ ایوارڈ اور نظریاتی تعلق موجود ہے۔

دوسرے لفظوں میں، ان تینوں کو کارپوریٹ "ریمن میگسیسے (Ramon Magsaysay) ایوارڈ سے "نوازا" گیا ہے۔ جب فورڈ فاؤنڈیشن جیسا عالمی کارپوریٹ ادارہ اس طرح کا ایوارڈ دیتا ہے، تو کیا اکثر یہ غیر اعلانیہ توقع نہیں ہوتی کہ تیسری دنیا کے ممالک میں کچھ مخصوص کردار یا ذمہ داریاں ادا کی جائیں گی؟

ان تینوں کی حالیہ تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان توقعات کو پوری مہارت کے ساتھ پورا کیا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ سونم وانگچک مودی اور بی جے پی کے ساتھ اس وقت مضبوطی سے کھڑے تھے جب دفعہ 370 کو ختم کیا گیا تھا، اور جب نوٹ بندی کا تباہ کن فیصلہ لوگوں پر مسلط کیا گیا تھا۔

اس مرحلے پر، جب سونم وانگچک کو نوجوانوں کی اس تاریخی جدوجہد کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے دیکھا جاتا ہے، تو ایم اے بی پی اور جان برٹاس جیسی شخصیات، جنھیں اکثر ایسے موقعوں کے منتظر کے طور پر دیکھا جاتا ہے، میڈیا کی توجہ کے

ساتھ میدان میں داخل ہوتی ہیں۔

اس تناظر میں، جو لوگ سیاسی تاریخ سے واقف ہیں، انھیں انا ہزارے کی تحریک کے مناظر یاد آتے ہیں، جہاں برندا کرات ان کے دائیں طرف اور بی جے پی لیڈر ارون جیٹلی ان کے بائیں طرف بیٹھے تھے۔

2011ء کی ہزارے-کیجریوال تحریک کے برعکس، جس نے بی جے پی اور اس سے منسلک گروہوں کی حمایت میں تیزی سے رفتار پکڑی تھی، جنتر منتر پر طلب کے احتجاج کو شروع میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔ تاہم، جب پارلیمنٹ مارچ کے دوران پولیس اور پیراملٹری فورسز نے طلبہ پر وحشیانہ تشدد کیا، تو اس سے ملک گیر غصہ پھیل گیا۔ Gen-Z کے نوجوانوں نے جنتر منتر کا رخ کیا، سڑکوں پر قبضہ کر لیا، جب کہ سوشل میڈیا مزاحمت کا ایک ایسا مرکز بن گیا جس نے مودی-شاہ حکومت کی امیج کو تار تار کر دیا۔ یہ تحریک جلد ہی مختلف ریاستوں میں پھیل گئی، جس نے حکومت کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، چاہے یہ قدم عارضی ہو یا حکمت عملی کے تحت، لیکن پیچھے ہٹنا ایک بڑی حقیقت ہے۔

یہ سی جے پی جیسی کسی ایک پارٹی کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ یہ بھارت کی Gen-Z کے ابھرتے ہوئے جمہوری اور سیکولر شعور کا نتیجہ تھا۔ انصاف اور آزادی کے لیے ان کی بے خوف جدوجہد ہی اصل متحرک طاقت تھی۔ سی جے پی جیسی پارٹی، جو محدود دائرہ کار رکھتی ہے اور عام آدمی پارٹی کی طرز پر بنی ہے، اکیلے یہ حاصل نہیں کر سکتی۔ ایک ایسی پارٹی جو عام آدمی پارٹی کی طرح دہلی تک محدود ایک مقامی تشکیل کے طور پر شروع ہوئی ہو، اس کے لیے ان حدود سے باہر پھیلنا انتہائی مشکل ہوگا۔

سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ جس طرح انا ہزارے اپنے اپنائے گئے کردار کو پورا کرنے کے بعد پیچھے ہٹ گئے تھے، اروند کیجریوال کا مزید آگے بڑھ کر سیاسی پارٹی بنانے کا فیصلہ کچھ لوگوں کے نزدیک سابقہ سمجھوتے سے انحراف کے طور پر دیکھا گیا، جسے بی جے پی کے ساتھ ایک غیر اعلانیہ معاہدے کی خلاف ورزی بھی کہا گیا۔ ان تمام باتوں سے اکثر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر سی جے پی متحرک بھی ہو جائے تو بھی اس بات کا امکان ہے کہ یہ صرف ایک ”نینو ماڈل“ یا عام آدمی پارٹی کی ایک کاپی بن کر رہ جائے گی، نہ کہ ایک آزاد سیاسی متبادل۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ راہل گاندھی، جن کے بارے میں مانا ہے کہ انھوں نے بھارت کی جمہوری تاریخ اور سماجی ڈھانچے کا گہرا مطالعہ اور سمجھ بوجھ حاصل کی ہے، نے اس پوری جدوجہد کے دوران سی جے پی سے انتہائی محتاط رابطہ رکھا۔

اروند کیجریوال، ابھجیت دیپکے اور وانگچک کی اہلیہ گیتانجلی جے اینگمو اکثر راہل گاندھی پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ ان کی آوازیں اکثر ان پلیٹ فارمز پر نمایاں رہیں جنھوں نے کانگریس پارٹی اور راہل گاندھی کو دباؤ میں رکھا۔

اس Gen-Z کے احتجاج کو ایک زیادہ منظم اور سیاسی طور پر مضبوط تحریک میں بدلنے میں اہم کردار 'ائیسا' (AISA- آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن) نے ادا کیا، جو کہ (CPI(ML لبریشن کی طلبا تنظیم ہے۔

ائیسا کی قومی صدر، نیہا بورا نے غیر معمولی ہمت اور نظریاتی شفافیت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تقریروں نے ملک بھر میں اثر دکھایا، خاص طور پر نوجوان خواتین کو متاثر کیا۔

23 دن کی بھوک ہڑتال کرنے کے باوجود، انھوں نے اس کی تشہیر نہیں کی برعکس وانگچک کے، جن کے فاقے کو قومی میڈیا نے خوب سراہا۔ یہ ایک بنیادی فرق کو ظاہر کرتا ہے: حقیقی بائیں بازو کے انقلابی کارپوریٹ کی سرپرستی والی شہرت کے طالب نہیں ہوتے۔ پرکاش راج اور شبانہ اعظمی جیسی شخصیات کے اصرار کے بعد ہی انھوں نے اپنی بھوک ہڑتال ختم کی۔

(باقی ص:46 پر)

یادِ ماضی

دوسری قسط

عالم بیگ

انقلاب 1857 کا ایک تحقیقی و تاریخی بیانیہ

مصنف: کم اے. ویگنر ———— مترجم: مہتاب پیامی

سپاہیوں کے ذہن میں "انصاف" کا ایک بہت مضبوط تصور تھا جو ان اخلاقی اصولوں پر مبنی تھا جنھیں وہ اپنے ملازمت کے معاہدے کا حصہ سمجھتے تھے۔ ترقی کے قواعد میں تبدیلی، جو انگریزوں کو تو بالکل منطقی لگتی تھی، سپاہیوں کی نظر میں ان کی روایتی شرائطِ ملازمت کی سنگین خلاف ورزی تھی۔ اس مسلمان افسر کے مطابق، ہندوستانی فوجی "یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب حق (Huk) کے اس قدیم اصول پر بھروسہ نہیں رہا کہ جب تک آدمی اپنی ڈیوٹی اچھی طرح کرتا ہے، اسے اس کا صلہ ملے گا۔"[45]

کم تنخواہ بنگال آرمی کے سپاہیوں کے لیے ایک اور پرانا مسئلہ تھا، خاص طور پر عالم بیگ جیسے سپاہیوں کے لیے جو اپنے وطن سے بہت دور تعینات تھے۔ برطانوی علاقوں سے باہر ڈیوٹی کے لیے سپاہیوں کو بھتہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ میدانِ جنگ میں اشیا کی بڑھی ہوئی قیمتیں پوری کر سکیں، اور یہ ان جوانوں کے لیے ایک ترغیب بھی تھی جو طویل عرصے تک اپنے گھروں سے دور رہتے تھے۔ تاہم، مہم ختم ہوتے ہی یہ بھتہ بند کر دیا جاتا تھا، اور ان سپاہیوں کے لیے جو مستقل طور پر نئے قبضے میں لیے گئے علاقوں میں تعینات تھے، یہ بات سخت غصے اور بیزاری کا باعث بنتی تھی۔[46]

1843 میں سندھ کی فتح کے بعد "بھتہ" کے مسئلے پر چھوٹی موٹی بغاوتیں ہوئی تھیں، اور 1849 میں پنجاب کے الحاق کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ سر اٹھانے لگا۔ اپنے قریبی تعلقات کی وجہ سے مختلف رجمنٹوں کے سپاہی اپنے احتجاج کو منظم کرنے کے قابل تھے، اور کئی رجمنٹوں کے نمائندے ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن جاتے تھے اور دور دراز علاقوں میں خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا[47]۔

اس وقت انگریزوں کو ڈر تھا کہ کہیں حال ہی میں شکست خوردہ سکھ ان باغی سپاہیوں کے ساتھ نہ مل جائیں۔ دہلی میں افسران کو کئی رجمنٹوں کے ایک ایسے اتحاد کے واضح آثار ملے جو زیادہ تنخواہ کے بغیر پنجاب میں خدمات انجام نہ دینے پر بضد تھے[48]۔ بعد میں ایک رجمنٹ کی بغاوت کے پانچ سرغنوں کو عمر قید (کالے پانی) کی سزا سنائی گئی، اور 66 ویں بنگال نیٹو انفنٹری کو، جس نے 1850 میں امرتسر کے قلعے پر قبضے کی کوشش کی تھی، توڑ دیا گیا اور اس کا نام فوج کی فہرست سے نکال دیا گیا[49]۔ بار بار سپاہی اور کمپنی تنخواہ جیسے مسائل پر دست و گریباں ہوتے رہے، کیوں کہ سپاہی ملازمت کی بہتر شرائط حاصل کرنے کو اپنا روایتی حق سمجھتے تھے۔ تاہم، کچھ واقعات ایسے تھے جو ان کے اختیار سے باہر تھے۔

عالم بیگ جیسے سپاہیوں کے لیے، اپنے دیہاتوں سے گہرے تعلق نے وفاداری کے حوالے سے ایک تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ جب 1857ء سے ایک سال پہلے، یعنی 1856ء میں انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا اور عملی طور پر سپاہیوں کے وطن پر قبضہ کر لیا، تو اس کے فوج پر اتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے جن کا انگریزوں نے کبھی اندازہ بھی نہ لگایا تھا۔ انگریزوں نے اودھ کے بادشاہ کو ان کی مبینہ جابرانہ بدانتظامی کا بہانہ بنا کر معزول کر دیا تھا، اور اس قبضے نے پورے علاقے میں شدید بے چینی پیدا کر دی تھی۔[50]

پولیس افسر شیخ ہدایت علی نے اس دھوکے کے احساس کی وضاحت کی جو سپاہیوں نے اس ناجائز الحاق کے بعد محسوس کیا تھا:

"ان سب کی رائے یہ تھی کہ حکومت نے ملکِ اودھ کا الحاق کر کے ناانصافی کی ہے، اور وہ سب بادشاہ اور ان کے

سرداروں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔"[51]

ہدایت علی مزید لکھتے ہیں کہ:

"سپاہی اودھ کے بادشاہ کو ان کی سلطنت سے محروم کیے جانے پر سخت برہم تھے، اور وہ آپس میں کھلم کھلا یہ باتیں کرتے تھے کہ انگریزوں پر اب کتنا کم بھروسا کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر اس بادشاہ کے ساتھ ان کے سلوک کے بعد جس نے اور جس کے آباؤ اجداد نے انگریزوں کے ساتھ ہمیشہ وفاداری نبھائی تھی۔"[52]

سپاہیوں کے اعتراض کا ایک بڑا حصہ یہ تھا کہ انگریزوں نے اودھ کے بادشاہ کے ساتھ اپنے معاملات میں دوغلے پن کا ثبوت دیا ہے، جس سے ان کے اقتدار کا اخلاقی جواز ختم ہو گیا تھا۔ اس صورت حال کو اس حقیقت نے مزید بگاڑ دیا کہ اودھ کے بادشاہ کی تقریباً 50,000 سپاہیوں پر مشتمل پوری فوج کو فارغ کر دیا گیا، جس نے ایک بار پھر ہندوستان میں انگریزوں کی طویل مدتی سیاسی حکمتِ عملی پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا۔

سپاہیوں سے گہری واقفیت رکھنے والے ایک ہندوستانی پولیس افسر، معین الدین حسن خان کے مطابق:

"اودھ پوربیہ نسل کی جائے پیدائش تھی، اور اس عدم اطمینان کے احساسات نے برطانوی حکومت کی ملازمت میں موجود پوری پوربیہ نسل کو متاثر کیا۔ ایک ہندوستانی ذہن کے لیے الحاق کا یہ عمل سراسر ناانصافی تھی جس نے مزاحمت کی ایک عالمگیر خواہش کو جنم دیا۔ بادشاہ اور ان سے وابستہ تمام لوگ، اگرچہ تقدیر کے فیصلے کے سامنے جھک گئے تھے، مگر اس کے بعد سے وہ انگریزوں کے کٹر دشمن بن گئے۔"[53]

آنے والے حالات کی علامت کے طور پر، 1856ء کے الحاق نے 34ویں بی این آئی (BNI) کے سپاہیوں کو مشتعل کر دیا تھا کہ وہ بنگال آرمی کی دیگر رجمنٹوں میں موجود اپنے بھائیوں کو خطوط لکھیں:

"ان خطوط نے ہر رجمنٹ کو ہندوستان کے قدیم شاہی خاندانوں کی یاد دلائی؛ اس بات کی نشاندہی کی کہ اودھ کے الحاق کے بعد وہاں کی فوج کو توڑ دیا گیا ہے، اور انگریزوں کے اودھ کے ساتھ تعلقات کے آغاز سے اب تک ایسا دوسری بار ہوا ہے۔ خطوط میں یہ بھی دکھایا گیا کہ ان کی جگہ اب پنجابیوں اور سکھوں کو بھرتی کر کے ایک پنجاب آرمی بنائی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کے منہ سے روٹی چھین لی گئی ہے جو تلوار کے سوا کوئی دوسرا پیشہ نہیں جانتے تھے۔ خطوط میں مزید کہا گیا کہ مستقبل میں مزید علاقوں کے الحاق کی توقع کی جا سکتی ہے، جس کے بعد مقامی (دیسی) فوج کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس طرح سپاہیوں پر یہ زور دیا گیا کہ قدیم بادشاہوں کو دوبارہ تخت نشین کرنے اور ان غاصبوں (انگریزوں) کو بھگانے کے لیے انھیں بغاوت کرنی ہوگی۔ "سپاہی ذات" کی فلاح و بہبود کا تقاضا یہی تھا اور ان کے سرداروں کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔"[54]

اودھ کے الحاق کو "جنرل اینلسٹمنٹ" (عام بھرتی کے قانون) کے ساتھ جوڑ کر، ان خطوط نے اس منظم کوشش کی طرف اشارہ کیا جو انگریزوں کی جانب سے سپاہیوں کے ذریعہ معاش اور ان کے خاندانوں کی خوش حالی کو ختم کرنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ فوج کے اندر برطانوی اصلاحات کی مزاحمت کو ایک ایسے فریضے کے طور پر پیش کیا گیا جس پر سپاہیوں کی **عزت** کا دارومدار تھا۔ دوسرے لفظوں میں، انگریز مجموعی طور پر ہندوستان میں جو کچھ کر رہے تھے اور خاص طور پر بنگال آرمی کے اندر جو تبدیلیاں لا رہے تھے، انھیں ایک ہی "وجود کو لاحق خطرے" کے طور پر دیکھا جا رہا تھا۔

اس وقت برطانوی افسران کو ان مسائل کا صرف مبہم سا اندازہ تھا جو ان کے ہندوستانی فوجیوں کو درپیش تھے اور وہ شاذ و نادر ہی ان کی شکایات کی اصل نوعیت کو سمجھتے تھے۔ جب شیخ ہدایت علی نے سپاہیوں کی اس وسیع پیمانے پر پائی جانے والی بیزاری کا ذکر کیا، تو انھوں نے یہ بھی اضافہ کیا:

"کوئی برطانوی افسر یہ نہ سمجھے کہ مذکورہ بالا باتیں سچ نہیں ہیں کیوں کہ وہ اس وقت ان سے واقف نہیں تھے: ہندوستان کا باشندہ اپنے افسر کے سامنے شاذ و نادر ہی اپنے دل کی بات کہتا

ہے؛ وہ صرف وہی کہتا ہے جو اس کے خیال میں صاحب کو خوش کر دے۔ سپاہی اپنی اصل رائے اس وقت کے لیے محفوظ رکھتے ہیں جب وہ واپس اپنی لائنوں (کمروں) میں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔"[55]

---*****---

جب عالم بیگ اور اس کے سپاہی پریڈ اور پہرے داری کے طویل دن کے بعد اپنی جھونپڑیوں کا رخ کرتے، تو سیالکوٹ کی برطانوی آبادی اپنے بنگلوں میں پناہ لیتی، جنھیں وہ تپتی گرمی سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے تھے:

"دروازوں پر چھپر کے سائے لگائے گئے تھے تاکہ دھوپ کی شدت کو توڑا جا سکے؛ دروازوں میں خس کی ٹٹیاں لگائی گئی تھیں اور ان پر چھڑکنے کے لیے پانی پاس ہی رکھا جاتا تھا؛ کھڑکیاں تاریک کر دی گئی تھیں، پنکھے لٹکا دیے گئے تھے اور عام طور پر تپش کو باہر رکھنے اور اندرونی درجہ حرارت کو ٹھنڈا رکھنے کے انتظامات کیے گئے تھے؛ اور دھوپ میں بلا ضرورت نکلنے سے بچنے کے لیے، باہر کے کاموں کا پروگرام صبح اور شام کے ٹھنڈے اوقات میں منتقل کر دیا گیا تھا..."[56]

سیالکوٹ میں سپرینٹنڈنگ سرجن ڈاکٹر جیمز گراہم اور ان کی بیٹی سارہ پہاڑوں کے اپنے آنے والے سفر کی آخری تیاریاں کر رہے تھے، یہ ان بے شمار اینگلو انڈین خاندانوں کی سالانہ روایت تھی جو میدانوں کی گرمی سے بچنے کے لیے پہاڑی مقامات کا رخ کرتے تھے۔[57] گراہم خاندان ان وسیع پروٹسٹنٹ آئرش خاندانوں میں سے ایک تھا جن کے ہندوستان کے ساتھ گہرے مراسم تھے اور وہ لارنس خاندان سے بخوبی واقف تھے۔ جان لارنس اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور ان کے چھوٹے بھائی رچرڈ لارنس لاہور میں پولیس کے کپتان تھے۔

خاندان کے بزرگ فرد کی حیثیت سے ڈاکٹر گراہم کو خاندان کے مستقبل کی بہت فکر رہتی تھی اور وہ رشتہ داریوں کے انتظامات اور اپنے عزیزوں کو کمپنی کی انتظامیہ میں اچھے عہدوں پر فائز کرانے میں مصروف رہتے تھے۔ ڈاکٹر گراہم کے اپنے تین بیٹے بنگال آرمی میں خدمات انجام دے رہے تھے، جب کہ ان کا بھتیجا (جس کا نام بھی جیمز گراہم تھا) 14 ویں بی این آئی میں افسر تھا۔ ڈاکٹر گراہم نے دہلی بینک کے حصص (اسٹاکس) میں بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور اگرچہ سارہ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن سیالکوٹ کے ایک رہائشی کے بقول، باپ بیٹی شاہانہ انداز میں رہتے تھے، "تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر کسی شہزادے کی طرح۔"[58]

گراہم کی رہائش گاہ، جو کہ پورے اسٹیشن کی سب سے شاندار عمارت تھی، یورپی پیادہ فوج کی بیرکوں اور چھاؤنی کے بالکل شمالی جانب 46 ویں بی این آئی کی لائنوں کے پیچھے واقع تھی[59]۔ لنڈور (Landour) میں مقیم اپنے بھتیجے جیمز کو لکھے گئے ایک خط میں گراہم نے جموں کے شمال مشرق میں واقع اس پہاڑی مقام کے بارے میں پرجوش انداز میں لکھا جس کا انتخاب انھوں نے اور سارہ نے کیا تھا:

"یہ ہندوستان میں اب تک دریافت ہونے والے صحت افزا مقامات میں سب سے بہترین مقام ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر سولہ میل تک پھیلی ہوئی ہموار زمین ہے، نہ تو کوئی گھنی جھاڑیوں والا جنگل ہے اور نہ ہی کوئی بہت گہرا بن، بلکہ یہ کسی نواب کے پارک کی طرح درختوں سے سجا ہوا ہے۔ یہ آٹھ سے نو ہزار فٹ بلند ہے اور یہاں ایک خوبصورت چشمہ ہے جس سے سال بھر پانی بہتا رہتا ہے..."[60]

ان کی روانگی 16 مئی کے لیے طے تھی تاکہ وہ ان گرم ہواؤں اور تندور جیسی تپش سے بچ سکیں جس سے، جیسا کہ تم جانتے ہو، مجھے سخت نفرت ہے۔[61]

دوسری طرف، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس موسم کا مقابلہ کرنے اور گرمیوں میں سیالکوٹ ہی میں قیام کرنے کے لیے تیار تھے۔ اسی سڑک پر چند بنگلوں کے فاصلے پر، چرچ کے بالکل ساتھ، ریورنڈ تھامس ہنٹر اور ان کی اہلیہ جین اپنے مشنری کام کے کٹھن شیڈول کو مزید تیز کر رہے تھے[62]۔ ہنٹر کو محض دو سال قبل اس

واضح مقصد کے ساتھ پادری مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ''چرچ آف اسکاٹ لینڈ'' کا پنجاب مشن قائم کریں۔ پنجاب ابھی حال ہی میں برطانوی قبضے کے بعد مشنریوں کے لیے کھلا تھا، اور ان مبلغین کے لیے جو اپنی مخصوص مذہبی تشریح پھیلانے کے لیے اپنی الگ قلمرو بنانا چاہتے تھے، یہ خطہ خاص طور پر پرکشش تھا۔ تھامس نے اپنی تقرری والے دن ہی ایک متقی سنڈے اسکول ٹیچر، جین اسکاٹ سے شادی کی تھی اور ایک ماہ بعد وہ ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

اسکاٹ لینڈ سے روانگی سے قبل اس جوڑے کی لی گئی تصاویر میں تھامس بغیر فریم والے چشمے اور مذہبی وضع کی داڑھی کے ساتھ کافی سخت گیر نظر آتے ہیں، جب کہ جین سیاہ لباس میں ملبوس اور سنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد تھامس ہنٹر نے اپنے مشن کے لیے سیالکوٹ کا انتخاب کیا اور اسکاٹ لینڈ میں اپنے چرچ کو لکھا:

''انتہائی احترام کے ساتھ میں اس منصوبے کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ اللہ کے فضل سے پنجاب میں مسیحیت کے مقصد کو آگے بڑھانے میں مددگار ہوگا۔ یقیناً چرچ کا اپنے مبلغین کو ہندوستان بھیجنے کا مقصد روحوں کی تبدیلی (تبلیغ) ہے، نہ کہ نوجوانوں کی تعلیم۔ ایک وقت تھا جب تعلیم ہی ہمارے چرچ کے لیے واحد راستہ تھا... لیکن اب حکومت خود آگے آرہی ہے اور یہ کام (تعلیم) اپنے ہاتھ میں لینے کی پیشکش کر رہی ہے۔ کیا یہ ہمارے لیے اس بات کا بلاوا نہیں ہے کہ ہم تبلیغِ مسیح میں اپنی کوششیں دگنی کر دیں؟ میں عاجزی سے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ کوئی تعلیمی ادارہ قائم نہ کیا جائے، بلکہ میں مقامی لوگوں کی طرح رہوں، یہاں تک کہ یہاں کی زبان اور رسوم و رواج پر مکمل عبور حاصل کر لوں اور ہر وقت اس عظیم نجات کی خوش خبری بلا خوف و خطر سناتا رہوں... اگر میری اور میری مشنری بیوی کی صحت نے جواب دے دیا تو بھی یہ اتنا بڑا نقصان نہیں ہوگا جتنا کہ ایک تعلیمی ادارے کا کسی ایک شخص پر منحصر ہونا۔''[63]

پرجوش مبلغ نے اس طرح خالص تبلیغ کا مشن شروع کرنے کی تجویز دی اور ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کا وہ روایتی طریقہ ترک کر دیا جسے مبلغین عام طور پر تبدیلیِ مذہب کے ایک راستے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسی خط میں تھامس ہنٹر نے یہ بھی اشارہ کیا تھا کہ ''سیالکوٹ یورپی افواج کا اسٹیشن ہے، اس لیے یہاں رہنا بالکل محفوظ ہے۔''[64]

بمبئی سے 1,700 میل سے زیادہ کا دشوار ترین سفر، جس کے دوران وہ بیماریوں کا شکار رہے[65]، تین ماہ میں طے کرنے کے بعد یہ جوڑا اپنے نوزائیدہ بیٹے کے ساتھ دسمبر 1856 میں سیالکوٹ پہنچا۔ وہ اپنے کام میں مدد کے لیے ایک نومسلم، محمد اسماعیل کو بھی ساتھ لائے تھے، لیکن یہاں پہنچ کر انھیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سیالکوٹ کوئی ان چھوئی زمین نہیں ہے جیسا کہ انھوں نے سوچا تھا۔ چھاؤنی کے چرچ اور کیتھولک چیپل کے علاوہ، امریکن پریسبیٹیرین چرچ نے پرانے شہر کے جنوب میں ایک مشن قائم کر رکھا تھا، جب کہ فرانسیسی راہباؤں نے چھاؤنی کے مغربی مضافات میں حال ہی میں ایک کانوینٹ بنایا تھا۔ ہنٹر خاندان سے پہلے ہی دوسرے یہاں قدم جما چکے تھے اور اپنے سائز کے لحاظ سے 1857 کے آغاز تک سیالکوٹ عملی طور پر پرجوش عیسائی مبلغین سے بھر چکا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہنٹر کے حریفوں کو بہت زیادہ کامیابی ملی تھی۔ امریکی مشن شروع سے ہی مشکلات کا شکار تھا؛ غیر مسیحی لڑکوں کے ایک چھوٹے سے اسکول کے علاوہ ان کے یتیم خانے میں صرف تین بچے تھے اور دو ہندوستانی مبلغ زیرِ تربیت تھے۔ دو سال بعد بھی، سیالکوٹ اور قریبی دیہاتوں کے بازاروں اور میلوں میں بھرپور (اگرچہ کچھ حد تک غیر پیشہ ورانہ) تبلیغی پروگرام کے باوجود وہ ایک بھی شخص کا مذہب تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ امریکی مبلغین خاصے غریب تھے اور صرف اس وقت برطانوی حکام اور دیگر پادریوں کے صدقہ و خیرات پر گزارا کرتے تھے جب دور دراز امریکہ سے ان کے اپنے چرچ کی معمولی مالی امداد پہنچنے میں ناکام ہو جاتی۔[66]

امریکی مشن کے سربراہ، اینڈریو گورڈن، ہنٹر خاندان کی آمد

پر اپنے علاقے کے حوالے سے فکر مند تھے اور انھوں نے نوٹ کیا کہ نئے آنے والے اس بات سے بے خبر لگتے ہیں کہ یہ علاقہ پہلے ہی مؤثر طریقے سے سنبھالا جا چکا ہے، جب کہ دیگر ضرورت مند علاقے اب بھی خالی پڑے ہیں۔ تاہم، گورڈن جلد ہی اپنے ابتدائی خدشات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور دونوں گروہوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے[67] اور انھوں نے اپنے اپنے تبلیغی علاقے تقسیم کر لیے۔ شہر کے جنوب میں امریکی مشن کی موجودگی کی وجہ سے، تھامس اور ان کی اہلیہ شمال میں چھاؤنی کے ایک گھر میں منتقل ہو گئے، جو چرچ اور صدر بازار کے درمیان واقع تھا[68]۔ ہنٹر نے اسکاٹ لینڈ میں اپنے چرچ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ امریکی مبلغین کی موجودگی اعتراض کے بجائے ایک بڑا فائدہ ثابت ہوگی کیوں کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے ہیں اور وہ شہر کے دوسری طرف تین میل دور ہیں، اس لیے وہ ہمارے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔[69]

جب عملی میدان متعیّن ہو گیا تو تھامس ہنٹر کو اپنے منصوبے کی اصل حقیقت کا سامنا کرنا پڑا۔ جو ریورنڈ ہنٹر پہلے بہت پُرعزم تھے، اب انھیں اپنے چرچ کو یہ سمجھانا تھا کہ موجودہ صورتِ حال ان کی ابتدائی توقعات سے مختلف ہے۔ انہوں نے کہا:

”میں امید کرتا تھا کہ آپ کے سامنے اپنے کام کا مکمل منصوبہ پیش کروں، لیکن وہ ابھی تک پوری طرح تیار نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے میں آپ سے کچھ وقت کی درخواست کرتا ہوں۔ مقصد، یعنی لوگوں کی روحوں کی ہدایت، ہمارے دلوں میں مضبوطی سے نقش ہے؛ مگر اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے طریقے ابھی تک میرے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہوئے۔ یہ وہ وقت ہے جب ہم امید کرتے ہیں کہ ہم بھی اور آپ بھی ہمارے لیے دعا کریں گے، تاکہ خداوند (یہوواہ) اپنی شان خود ظاہر فرمائے۔“[70]

تھامس اور جین ہنٹر نے خود کو سیالکوٹ میں اس حال میں پایا کہ انھیں اسکاٹ لینڈ میں موجود اپنی جماعت (کلیسیا) کے سامنے بہت کچھ ثابت کرنا تھا۔ تھامس کو اپنے اس سابقہ دعوے سے دستبردار ہونا پڑا کہ وہ تبلیغ کے لیے تعلیم کا سہارا نہیں لیں گے، اور جلد ہی انھوں نے دو چھوٹے مقامی اسکول قائم کر لیے، ایک لڑکوں کے لیے اور دوسرا لڑکیوں کے لیے۔ اس کے علاوہ، وہ اتوار کے روز ہندی زبان میں ایک مذہبی تقریب (سروس) منعقد کرتے تھے جس کے سامعین میں زیادہ تر ان کے اپنے ملازمین ہوتے تھے، جب کہ چھاؤنی میں موجود برطانوی افسران اور فوجیوں کے لیے بھی وہ الگ سے دعائیہ خدمات انجام دیتے تھے۔[71]

یہ سرگرمیاں ان کا سارا وقت لے لیتی تھیں، اور اس حقیقت کے باوجود کہ ان کا نوماہ کا بیٹا تھا، گرمیوں میں پہاڑوں کی ٹھنڈی آب و ہوا کا سفر ایک ایسی آسائش تھی جس کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح امریکی مشن میں موجود ان کے دوستوں کا حال تھا جو بہت ہی محدود بجٹ پر گزارا کر رہے تھے۔ اینڈریو گورڈن نے اصل میں سیالکوٹ کا انتخاب اس کی شہرت یافتہ معتدل آب و ہوا کی وجہ سے کیا تھا، لیکن پھر بھی ا[illegible]، نارتھ کیرولائنا (امریکہ) کے باشندے کے لیے یہاں کی گرمی ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی:

”جس طرح دسمبر میں امریکہ میں شمال کی برفانی ہوا چلتی ہے جو ہر سوراخ اور دراڑ سے برف اندر دھکیل دیتی ہے اور باہر نکلنے والے کی جان خطرے میں ڈال دیتی ہے، بالکل اسی طرح ہندوستان میں مئی یا جون کی لو (گرم ہوا)، جو باریک مٹی سے بھری ہوتی ہے، ہمارے گھروں میں سرایت کر جاتی ہے، باہر نکلنے والوں کو جھلسا دیتی ہے اور ہم پردیسیوں کے خون کو کھولانے لگتی ہے۔“[72]

14 مئی کی صبح، پیغام رساں کی آمد اور چھاؤنی میں رات بھر کی ہلچل کے بعد، شہر کے جنوب میں ابھی تک خاموشی تھی۔ تاہم، صبح 9 بجے گورڈن اور ان کی چھوٹی سی جماعت (جس میں ان کی اہلیہ ربیکا، ان کی بہن اور دو دیگر امریکی مبلغین اور ان کے خاندان شامل تھے) کے پاس وردی میں ملبوس ایک سوار تیز رفتار گھوڑے پر پہنچا اور ڈپٹی کمشنر کا ایک ہنگامی پیغام تھمایا:

”پیارے مسٹر گورڈن: براہِ کرم اپنی تبلیغ فی الحال روک

دیں، خاص طور پر اپنے مقامی مبلغین کو ادھر ادھر جانے کی اجازت نہ دیں۔ کیا آپ نے سنا ہے کہ باغیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا ہے اور یورپی آبادی کا قتلِ عام کیا ہے؟ یہ خبر مجھے کل رات ہنگامی پیغام کے ذریعے ملی ہے۔ ڈاک کا نظام کٹ چکا ہے اور ٹیلی گراف کی لائنیں ٹوٹ گئی ہیں۔ براہِ کرم اس کا ذکر کسی بھی مقامی شخص سے نہ کریں۔ آپ کا مخلص، ایچ مونکٹن"

امریکی مشنریوں نے اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کی اور سارا دن اندر ہی رہے۔ لنچ کے وقت کسی بھی بڑے کو بھوک نہ تھی، صرف بچوں نے کھانا کھایا جو ان خدشات سے بالکل بے خبر تھے جنھوں نے ان کے والدین کو بے چین کر رکھا تھا۔ چند گھنٹوں بعد، گورڈن کو ایک خصوصی پیغام رساں کے ذریعے ایک اور خط ملا، جو اس بار لاہور کے ایک واقف کار کی طرف سے تھا اور اس میں جنوب میں پیش آنے والے واقعات کی مزید تفصیلات موجود تھیں۔ ان خبروں نے ان کے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی:

"مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ دہلی میں کشتیوں کا پل میرٹھ سے آنے والے "تھرڈ لائٹ کیولری" کے 150 باغیوں نے قبضے میں لے لیا ہے۔ 54 ویں نیٹیو انفنٹری کو ان کے خلاف بھیجا گیا تھا، لیکن انھوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور باغیوں سے جا ملے؛ اور میں نے سنا ہے کہ ان کے افسران مارے گئے ہیں۔ 54 ویں کی کمان کرنے والے کرنل رپلے کے مارے جانے کی بھی اطلاع ہے۔ دہلی کی پوری مقامی آبادی اٹھ کھڑی ہوئی ہے؛ اور میرا خیال ہے کہ اب تک دہلی میں ہر عیسائی قتل کیا جا چکا ہے۔ کمشنر مسٹر فریزر، قلعے کے محافظوں کے کپتان ڈگلس، دہلی بینک کے مسٹر بیرس فورڈ اور دیگر اس وقت قتل کر دیے گئے تھے جب ٹیلی گراف پیغام بھیجا گیا تھا، اور انھیں بھی اسی انجام کی توقع تھی۔ اسلحہ خانہ باغیوں کے قبضے میں جا چکا ہے۔ لاہور میں موجود تمام دیسی فوجیوں کو نہتا کر دیا گیا ہے۔ یہ بہت ہی افسوس ناک خبر ہے۔"[74]

دہلی میں، ٹیلی گراف آفس کے دو اسسٹنٹ اپنے ساتھیوں کو امبالہ میں دیوانہ وار پیغامات بھیج رہے تھے کیوں کہ حالات لمحہ بہ لمحہ بگڑ رہے تھے۔ 11 مئی کی دوپہر کو اپنی جان بچا کر بھاگنے سے پہلے ان کا آخری پیغام کافی مختصر اور تلخ تھا:

"کئی افسر ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ شہر میں شدید اشتعال پایا جاتا ہے۔ فوج بھیجی گئی ہے، لیکن ابھی کچھ معلوم نہیں۔ معلومات بعد میں بھیجی جائیں گی۔"[75]

اس پیغام سے اس تباہی کی حقیقی حد کا اندازہ لگانا مشکل تھا جو دہلی میں انگریزوں پر ٹوٹی تھی، لیکن تب سے اب تک مزید تفصیلات سامنے آ چکی تھیں، اور 14 مئی کو سیالکوٹ میں گورڈن اور دیگر لوگوں تک پہنچنے والی خبروں نے انھیں ہذیانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

گورڈن کا چھوٹا بیٹا سائلس، اس وقت بخار میں مبتلا تھا اور ڈاکٹر گراہم نے اسے دھوپ میں نکالنے سے سختی سے منع کیا تھا، جس کا مطلب تھا کہ فرار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ فرار ہو کر جاتے بھی کہاں؟ یہ ایک الگ سوال تھا۔ ان کی صورت حال انتہائی مایوس کن تھی، جیسا کہ گورڈن نے بعد میں یاد کرتے ہوئے لکھا:

"ہمارے اور قریب ترین ساحلی شہر کے درمیان سفر کا تیز ترین ذریعہ 1,400 میل کا راستہ تھا، جہاں قدم قدم پر ہزارہا موتیں کھڑی تھیں۔ کامیاب روپ بدلنا بھی انتہائی مشکل تھا۔ ہم اپنا لباس اور رنگت تو بدل سکتے تھے، لیکن خود کو بے نقاب کیے بغیر چلنا، بولنا، کھانا اور پینا شاید ناممکن ہوتا؛ اور نہ ہی ہم کسی تاریک غار میں چھپ کر جانوروں کی طرح سو سکتے تھے تاکہ نظروں سے بچ سکیں۔ پھر بھی ہم سب نے فطری طور پر کچھ ضروری اشیا کی گٹھریاں بنانی شروع کر دیں تاکہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں انھیں اٹھا کر بھاگ سکیں۔"[76]

مونکٹن کی اس تنبیہ نے کہ یہ خبر کسی ہندوستانی کو نہ بتائی جائے، گورڈن اور دیگر مشنریوں کو اپنے ہی ملازموں اور احاطے سے باہر کے مقامی لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور کر دیا، جو کہ اب وسوسوں اور پاگل پن کی حد تک پہنچ چکا تھا... "کیوں کہ یہ

جاننا ناممکن تھا کہ کس پر بھروسا کیا جائے[77]۔" ہندوستان میں، یہاں تک کہ غریب یورپی بھی مقامی ملازموں کے گھیرے میں رہتے تھے جو ان کی روزمرہ زندگی کے ذاتی ترین کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے: انڈین آیاں سفید فام بچوں کی دیکھ بھال کرتیں، مقامی چوکیدار گھر کے دروازے پر پہرہ دیتا، اور مقامی باورچی کھانا تیار کرتا۔ یہ تصور کہ مقامی ملازم یا غلام اپنے آقاؤں کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے، نوآبادیاتی معاشروں کے قدیم ترین خوفوں میں سے ایک تھا، اور یہ خوف نسلی بنیادوں پر ابھرا، کیوں کہ ہر ایک ہندوستانی اچانک ایک ممکنہ خطرہ بن گیا۔

کمزوری اور بے یقینی کے اس شدید احساس کا مکمل اظہار گورڈن کی اس تحریر میں ملتا ہے جب وہ اس طویل اور تپتی دوپہر کو اپنے بنگلے میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے:

"کیا وہ بھی وہی جانتے ہیں جو ہم جانتے ہیں؟" ہم نے پریشانی میں ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔ ہمارا چہرہ ہی انھیں بتا رہا ہوگا کہ ہم کسی ہول ناک خوف کا شکار ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے چہروں پر لکھی ہوئی تشویش کو پڑھنے میں ناکام نہیں رہے ہوں گے۔ سنو! کیا ہمارے سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟ کیا یہ ہتھیاروں کی آواز ہے یا کسی شادی کی تقریب کے پٹاخے؟ یہ دیسی سوار اتنی غیر معمولی رفتار سے کہاں جا رہے ہیں؟ اوہ! یہ سیاہ چہروں والے مسلمان اور سنجیدہ وضع قطع کے بت پرست، کتنے غصے اور بیزاری سے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں! ہم جانتے ہیں کہ وہ کتنے مکار اور غدار ہیں! اگر انھوں نے خبر سن لی ہے، تو وہ بالکل لاعلم بننے کا ڈھونگ کیوں کر رہے ہیں؟ ان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے! وہ ہمارے سروں کو کوڑیوں کے دام بیچ دیں گے؛ اور ان میں سے ہر ایک ایسا لگتا ہے جیسے کوئی قاتل اپنے موقع کے انتظار میں ہو۔"[78]

آخر کار، آٹھ گھنٹے کے قیامت آثار انتظار کے بعد، گورڈن، ایک اور امریکی مشنری اور ایک ہندوستانی مسیحی کے ساتھ خبریں جمع کرنے اور اگلے لائحہ عمل کا اندازہ لگانے کے لیے باہر نکلے۔ تھوڑی سی ٹھنڈی ہوتی ہوئی شام میں، وہ شہر سے گزرتے ہوئے سول لائنز میں ڈسٹرکٹ کمشنر مونکٹن کے گھر پہنچے۔ مونکٹن کے گھر پر انھوں نے دیکھا کہ کمشنر دو مہمانوں، اسسٹنٹ کمشنر کیپٹن سی اے میک موہن اور اسٹیشن کے پادری ریورنڈ ڈبلیو بوائل کے ساتھ رات کے کھانے پر بیٹھے ہیں۔ امریکی مبلغین کی طرح، ان تینوں کو بھی بھوک نہیں تھی، اور وہ......

"کھانا نہیں کھا رہے تھے، بلکہ صرف ہندوستانی ملازموں کے سامنے دکھاوے کے طور پر کھانے کی اداکاری کر رہے تھے۔ برف جیسی سفید وردی پہنے، کمروں پر چوڑی پیٹیاں باندھے ہوئے مسلمان ویٹر اپنے آقاؤں کے پیچھے کسی بزرگ کی طرح خاموش کھڑے تھے[79]، اور ننگے پاؤں اتنی خاموشی سے اندر باہر جا رہے تھے جیسے کالے چہروں والے بھوت ہوں؛ ان کی موجودگی میں منڈلاتے ہوئے خطرے کی طرف اشارہ کرنے سے بھی سختی سے گریز کیا جا رہا تھا۔"[80]

صورت حال کی مضحکہ خیزی کے باوجود، مونکٹن، گورڈن اور دیگر ساتھیوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب رہے کہ وہ خود بھی اتنے ہی اندھیرے میں ہیں جتنے وہ، اور ان کے پاس دینے کے لیے نہ کوئی مشورہ تھا اور نہ ہی تسلی۔ مونکٹن کو تو یہ تک یقین نہیں تھا کہ ان کی کمان میں موجود ہندوستانی پولیس اہلکار، جو گھر کے قریب ہی مقیم تھے، قابلِ بھروسا ہیں بھی یا نہیں۔ وہ اہلکار بجائے اعتماد اور طاقت کا ذریعہ بننے کے، اب کمزوری اور خطرے کا باعث بن چکے تھے[81]۔ جب مشنری وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ریورنڈ بوائل نے، جو واضح طور پر ہیجان میں مبتلا تھے اور بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی سن نہ لے، انھیں دروازے تک چھوڑا اور ہندوستانی نومسلم برادر اسکاٹ سے التجا کی:

"اسکاٹ، اب تمھارا وقت ہے۔ تم مقامی ہو اور مقامیوں کو جانتے ہو۔ اگر تم حکومت کے لیے معلومات حاصل کر سکو تو تمھیں بڑا انعام دیا جائے گا۔"[82]

بوائل کی اسکاٹ سے کی گئی یہ والہانہ التجا اس تصور کی نفی

کر رہی تھی کہ انگریز واقعی اس سرزمین کو جانتے تھے؛ بحران کے وقت یہ مقامی مخبر ہی تھے جن پر بھروسا کیا جانے لگا۔ اسکاٹ کے مسیحی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس شک سے مستثنیٰ تھے جو اس وقت تمام دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

گورڈن اور ان کے دو ساتھی پھر گاڑی چلا کر کرنل ڈاوز کے پاس گئے، جو یورپی توپ خانے کی کمان کر رہے تھے اور اسکول آف مسکیٹری کے انچارج بھی تھے۔ اگرچہ یہ بوڑھا افسر سویلین حکام کے مقابلے میں زیادہ پرسکون تھا، پھر بھی اس نے دھیمے لہجے میں گفتگو کرنا ضروری سمجھا، اور جب کسی مقامی شخص کو قریب آتے دیکھتا تو کبھی جملہ بیچ میں ادھورا چھوڑ دیتا یا اسے مبہم انداز میں ختم کرتا، کیوں کہ جیسا کہ اس نے خود کہا، "ان میں سے بہت سے اتنی انگریزی جانتے ہیں کہ یہاں وہاں سے ایک آدھ لفظ پکڑ کر ہماری گفتگو کا موضوع سمجھ سکیں[83]۔" ڈاوز نے مشنریوں کو مشورہ دیا کہ وہ شہر کے جنوب میں واقع اپنی الگ تھلگ عمارت میں رہنے کے بجائے (جہاں ضرورت پڑنے پر مدد پہنچنا مشکل تھا) پاس ہی کے ایک ایسے بنگلے میں منتقل ہو جائیں جس کا مالک پہاڑوں پر گیا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گورڈن، ان کا خاندان اور چار دیگر مشنری خاندان، جو کل ملا کر بتیس افراد تھے، چھاؤنی کے بالکل کنارے پر واقع اس خالی گھر میں منتقل ہو گئے۔ مشنری اب شہر سے تو جتنے دور ہو سکتے تھے ہو گئے، لیکن اب وہ سپاہیوں کی لائنوں (بیرکوں) کے خطرناک حد تک قریب تھے۔

گورڈن نے نوٹ کیا، 'جیسے ہی ہمارے مشنری گروہ نے اس نسبتاً محفوظ جگہ پر پناہ لی، پوری چھاؤنی میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سپاہی آج رات ہی بغاوت اور تمام انگریزوں کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں ہدایت دی گئی کہ اگر بغاوت ہوئی تو ہم جتنا ممکن ہو سکے شمال میں ڈیڑھ سو گز دور واقع [برطانوی فوجیوں کی] بیرکوں کی طرف بھاگیں۔[84]

وہاں پہنچنے کے بعد مشنریوں نے خود کو دو گروہوں میں تقسیم کر لیا: ایک کو گھر کی چھت سے پہرہ دینا تھا، جب کہ دوسرا گروہ رات بھر دعا میں مصروف رہا۔ گورڈن خود کو گھر کے باہر اندھیرے میں زمین پر بیٹھ کر زیادہ محفوظ محسوس کر رہے تھے، اس امید میں کہ اگر کوئی ہنگامہ ہوا تو شاید انھیں غلطی سے ہندوستانی سمجھ لیا جائے: "ہمارے سفید چہرے، یورپی لباس اور گھر ہی ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں[85]۔" بہر حال، کچھ بھی پیش نہ آیا اور تمام یورپی باشندے بشمول اینڈریو گورڈن، ڈاکٹر گراہم، ان کی بیٹی سارہ، اور تھامس و جین ہنٹر اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ اس وقت سکون کا سانس لے سکے جب 14 مئی 1857 کی رات سیالکوٹ پر چھا گئی۔ یہ وہی دن تھا جب برطانوی سلطنت کے اس دور افتادہ کونے تک اس بغاوت کی خبر پہنچی تھی جسے "جنگِ آزادی" یا "ہندوستانی بغاوت" کے نام سے جانا گیا۔

---*****---

اس دن سیالکوٹ میں مشنریوں اور تمام برطانوی حکام کی جانب سے خود کو پرسکون ظاہر کرنے اور معمولاتِ زندگی جاری رکھنے کا جو ایک مصنوعی ناٹک (Charade) رچایا گیا تھا، وہ سراسر فضول تھا کیوں کہ مقامی فوجیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ عالم بیگ، دیگر سپاہیوں اور سیالکوٹ کی زیادہ تر مقامی آبادی کو میرٹھ کی بغاوت اور دہلی کے سقوط کا علم تقریباً اسی وقت ہو چکا تھا جب انگریزوں کو اس کی اطلاع ملی۔ سول لائنز میں مونٹگمری تک پیغام پہنچنے اور 35 ویں رجمنٹ کے سپاہیوں کی جانب سے اس خبر پر گھبراہٹ میں باہر نکل آنے کے درمیان صرف ڈیڑھ گھنٹے کا فرق تھا۔

رات کی اس ہلچل کے تناظر میں، جس کی وجہ کا کبھی کھل کر ذکر نہیں کیا گیا تھا، 46 ویں رجمنٹ کے برطانوی افسران نے 14 مئی کی صبح کی پریڈ کے دوران سپاہیوں کی وفاداری کو پرکھا؛ تمام سپاہیوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ کسی بھی طرح غیر مطمئن نہیں ہیں، بلکہ برطانوی پرچم کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے[86]۔ عالم بیگ اور اس کی رجمنٹ نے اس صبح بظاہر جس وفاداری کا بھی اظہار کیا ہو، حقیقت یہ تھی کہ وہ بغاوت کی خبر سے اندرونی طور پر شدید بے چین تھے اور وہ بھی صرف ہمت کا مظاہرہ کر رہے

تھے۔ اس وقت کے ایک ہندوستانی بیان میں بتایا گیا کہ سپاہیوں نے اس خبر کو کس طرح لیا:

”جب بغاوت کی خبر عام ہوئی تو سپاہیوں کی اشتعال انگیزی میں اضافہ ہو گیا۔ پوری فوج کو محسوس ہوا کہ حکومت پر ان کا اعتماد ختم ہو چکا ہے، اور حکومت صرف انھیں سزا دینے کے موقع کی تلاش میں ہے؛ یہی وجہ تھی کہ اپنے افسران کی باتوں اور وعدوں پر ان کا بھروسا ختم ہو چکا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ حکومت ابھی تو (جھوٹے) دلاسے دے رہی ہے، لیکن جب دوبارہ حالات معتدل ہوں گے وہ اپنے کہے پر عمل نہیں کرے گی۔“[87]

اس بغاوت نے انگریزوں اور ان کے قریبی حلیفوں (سپاہیوں) کے درمیان تعلقات کے ایک تباہ کن خاتمے کا اشارہ دے دیا تھا، جس نے پورے شمالی ہندوستان کے ہر سپاہی کو متاثر کیا۔ لیکن یہ بحران ایک طویل عرصے سے پک رہا تھا، جیسا کہ دور دراز دہلی میں موجود مقامی پولیس افسر معین الدین حسن خان کی تحریر سے واضح ہوتا ہے: ”جب بغاوت شروع ہوئی، تو اس سے پہلے ہونے والے تمام واقعات کی پوری قوت اور اہمیت واضح ہو گئی، اور لوگ سمجھ گئے کہ ان کا مطلب کیا تھا۔“[88]

اگر میرٹھ اور دہلی کی بغاوتوں کی خبر سیالکوٹ کے باشندوں پر اینڈریو گورڈن کے بقول کسی تباہ کن سمندری طوفان کی طرح ٹوٹی تھی، تو سچ یہ تھا کہ اس طوفان کے بادل پچھلے کافی عرصے سے منڈلا رہے تھے۔

مآخذ

45. Sleeman, *On the Spirit of Military Discipline*, p. 18. Italics and parenthesis in original.
46. Roy, *The Politics of a Popular Uprising*, pp. 24–25.
47. *Kaye's and Malleson's History*, I p. 310.
48. Ibid., pp. 312 and 313–15.
49. See also Roy, *The Politics of a Popular Uprising*, pp. 25.
50. See also Mukherjee, *Awadh in Revolt*, pp. 1–63.
51. 'Shaik Hedayut Ali', p. 5.
52. Ibid., p. 6.
53. Mainodin Hassan Khan, in C. T. Metcalfe (trans.), *Two Native Narratives of the Mutiny in Delhi*, Westminster: A. Constable and Co., 1898, p. 37.
54. Ibid., pp. 37–8.
55. 'Shaik Hedayut Ali', p. 2.
56. Gordon, *Our India Mission*, p. 129.
57. Dr Graham to J. Graham, 8 May 1857, *The Graham Indian Mutiny Papers*, p. 17.
58. Gordon, *Our India Mission*, p. 135; and letter by A. Gordon, 16 July 1857, *Evangelical Depository*, p. 314.
59. Gordon, *Our India Mission*, p. 135.
60. Dr Graham to J. Graham, 8 May 1857, *The Graham Indian Mutiny Papers*, p. 17.
61. Ibid.
62. See Youngson, *Forty Years*, pp. 70–7.
63. Letter from T. Hunter, 2 April 1856, Youngson, *Forty Years*, pp. 78–79.
64. Ibid., p. 78.
65. Ibid., p. 89.
66. Gordon, *Our India Mission*, pp. 89–90.
67. Ibid., p. 128.
68. Ibid., pp. 128–9.
69. Letter from T. Hunter, 24 Jan. 1857, Youngson, *Forty Years*, pp. 92–93.
70. Ibid., p. 93.
71. Letter from T. Hunter, 28 Feb. 1857, ibid., p. 94.
72. Gordon, *Our India Mission*, p. 129
73. Ibid., pp. 129–30.
74. Ibid.
75. Edward Vibart, *The Sepoy Mutiny; as seen by a Subaltern from Delhi to Lucknow*, London: Smith Elder and Co., 1898, p. 262. For the story of Delhi during the Indian Uprising, see William Dalrymple, *The Last Mughal: The Fall of Delhi 1857*, London: Bloomsbury, 2006.
76. Gordon, *Our India Mission*, pp. 130–1.
77. Ibid.
78. Ibid.
79. The allusion is to the elders of the Presbyterian church.
80. Ibid., p. 132.
81. Ibid.
82. Ibid.
83. Ibid.
84. Ibid., p. 133.
85. Letter from A. Gordon, 15 May 1857, *Evangelical Depository*, p. 210.
86. Ibid., p. 209.
87. Khan, *The Causes of the Indian Revolt*, p. 53
88. Mainodin Hassan Khan, in Metcalfe, *Two Native Narratives*, p. 38.
89. Gordon, *Our India Mission*, p. 129.

(جاری)□□

حفظان صحت

اجوائن خراسانی کے فوائد

ڈاکٹر ام فرح۔ ایم۔ڈی (ڈرمیٹولوجی)

اجوائن خراسانی، جسے عربی میں "بنج"، انگریزی میں "Henbane" اور سائنسی زبان میں *Hyoscyamus niger* کہا جاتا ہے، طب یونانی اور دنیا کی قدیم ترین علاج گاہوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کے نام میں "اجوائن" شامل ہے، لیکن یہ عام باورچی خانے میں استعمال ہونے والی دیسی اجوائن سے بالکل مختلف اور ایک الگ نباتاتی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک انتہائی زہریلی مگر دوسری طرف حیرت انگیز شفائی خواص کی حامل جڑی بوٹی ہے، جس کا درست اور متوازن استعمال انسان کو کئی تکلیف دہ بیماریوں سے نجات دلاتا ہے۔

اجوائن خراسانی کا تعلق (Solanaceae) خاندان سے ہے، جس میں آلو، ٹماٹر اور دھتورا جیسے پودے بھی شامل ہیں۔ اس کے پودے کا قد عام طور پر ایک سے تین فٹ تک ہوتا ہے۔ اس کے پتے روئیں دار، چپچپے اور ناگوار بو والے ہوتے ہیں۔ اس کے پھول پیلے رنگ کے ہوتے ہیں جن پر ارغوانی یا جامنی رنگ کی باریک رگوں کا جال بنا ہوتا ہے، جو دیکھنے میں کافی دلکش مگر پراسرار نظر آتے ہیں۔ یہ پودا بنیادی طور پر وسطی ایشیا، ایران، افغانستان اور خاص طور پر خراسان کے خطے میں کثرت سے پایا جاتا ہے، اسی نسبت سے اسے "اجوائن خراسان" کہا جاتا ہے۔

اجوائن خراسان کی افادیت اور اس کے زہریلے پن کی وجہ اس میں پائے جانے والے طاقتور الکلائڈز (Alkaloids) ہیں، جن میں بنیادی طور پر درجہ ذیل شامل ہیں:

ہائیوسائمن (Hyoscyamine): یہ اعصابی نظام کو سکون دینے اور درد کی شدت کو کم کرنے میں مدد کرتا ہے۔

اسکوپولامائن (Scopolamine): یہ دماغی تناؤ، الٹی، اور بے چینی کو کنٹرول کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

ایٹروپائن (Atropine): یہ جسمانی رطوبتوں اور پٹھوں کے کھچاؤ کو روکنے کے لیے جانا جاتا ہے۔

طبی فوائد اور استعمال حکما اور اطبا صدیوں سے اسے مختلف امراض کے علاج کے لیے استعمال کرتے آ رہے ہیں:

- یہ اعصابی نظام کو سن کرنے اور شدید دردوں (مثلاً عرق النساء، جوڑوں کا درد اور شدید سر درد) کو دور کرنے کے لیے بے حد مفید ہے۔ شدید بے خوابی (Insomnia) کے مریضوں کے لیے اس کی متوازن مقدار نیند لانے کا باعث بنتی ہے۔
- معدے، آنتوں اور مثانے کے اینٹھن اور کھچاؤ میں فوری راحت پہنچاتی ہے۔
- جسم میں اضافی رطوبتوں جیسے کہ بکثرت تھوک کا آنا یا سانس کی نالیوں میں بلغم کے افراز کو کم کرتی ہے۔

قدیم ادویات میں اس کے بیجوں کی دھونی (Smoke) کے ذریعے دانتوں کے کیڑے اور درد کا علاج کیا جاتا رہا ہے، جب کہ اس کے تیل سے کان کے درد کا مداوا بھی کیا جاتا ہے۔

احتیاط اور مضر اثرات: اجوائن خراسان ایک سمیاتی (زہریلی) بوٹی ہے۔ اس کی زائد مقدار انسان کو ذہنی تفکرات، فریب نظر اور ہذیان کی حالت میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اس کے سائڈ افیکٹ کی وجہ سے گلا خشک ہونا، آنکھوں کی پتلیوں کا پھیل جانا، دل کی دھڑکن تیز ہونا اور شدید قبض بھی ہو سکتا ہے۔

اجوائن خراسان قدرت کا ایک ایسا شاہکار ہے جو ایک طرف زہر کی خصوصیات رکھتا ہے تو دوسری طرف ماہر طبیب کے ہاتھوں میں آ کر تریاق اور شفا کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کا خود سے استعمال انتہائی خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے ہمیشہ کسی تجربہ کار حکیم یا معالج کے مشورے اور ہدایت کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

■■■

چراغ خانہ

ماں کی حیثیت سے تربیت کی ذمہ داری

سلمیٰ شاہین امجدی

جمعہ کی دوپہر تھی۔ حرا کی چھوٹی خالہ زاد بہن، نور، جو ابھی تین سال کی تھی، ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ حرا اسے کہانی سنا رہی تھی جب نور نے اچانک پوچھا، آپی، اللہ کیسے دیکھتا ہے؟

حرا کچھ دیر خاموش رہی، پھر آسان الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی۔ نور کی معصوم آنکھوں میں تجسس اور یقین دونوں تھے۔ یہ منظر دیکھ کر بی اماں، جو قریب ہی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں، مسکرادیں۔

بیٹا، دیکھو، یہ بچی تم پر کتنا اعتماد کرتی ہے۔ جو کچھ تم اسے بتاؤ گی، وہی اس کے ذہن میں نقش ہو جائے گا۔

حرا نے نور کو کھلونوں میں مصروف دیکھ کر بی اماں سے پوچھا، نانی، مجھے ابھی شادی میں تو وقت ہے، ماں بننے میں بھی۔ پھر بھی آپ ہمیشہ اس بارے میں بات کیوں کرتی ہیں؟

بی اماں نے سنجیدگی سے جواب دیا، کیوں کہ بیٹا، ماں بننے کی تیاری شادی کے بعد نہیں، آج سے، ابھی سے شروع ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی نگہبانی کے بارے میں سوال ہوگا۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں ہے، اور اسی حدیث میں آگے فرمایا، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے، اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہوگی۔

حرا نے سوچتے ہوئے پوچھا، نانی، مگر بچے کی تربیت میں سب سے پہلی چیز کیا ہے؟

بی اماں نے قرآن کی طرف اشارہ کیا۔ سب سے پہلی اور بنیادی چیز عقیدہ اور توحید ہے۔ سورۃ لقمان میں دیکھو، ایک باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی کہتا ہے، يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ، اے میرے بیٹے، اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ سوچو، سب سے پہلی تربیت بچے کے دل میں اللہ کا تصور بٹھانا ہے، پھر باقی سب کچھ۔ اور اگر ہم قرآن میں مثالی ماؤں کو دیکھیں، تو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کا واقعہ ملتا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ انہوں نے اپنے پیٹ میں موجود بچے کو ہی اللہ کے لیے وقف کرنے کی نیت کر لی تھی، فرمایا، رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا، اے میرے رب، میں نے جو میرے پیٹ میں ہے، اسے تیرے لیے وقف کرنے کی نذر مانی ہے۔

سوچو! حرا، تربیت کی نیت پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو سکتی ہے۔

اسی شام حرا کی امی، جو کچن سے واپس آئی تھیں، بات میں شامل ہو گئیں۔ بیٹا، تمہیں یاد ہے، جب تم چھوٹی تھیں تو میں تمہیں سوتے وقت آیت الکرسی سناتی تھی؟ آج بھی تم خود ہی یہ آیت پڑھتی ہو، ہے نا؟

حرا نے مسکرا کر سر ہلایا۔

یہی تو تربیت کا اثر ہے بیٹا۔ امی نے کہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو۔ یہ حدیث ابو داؤد میں ہے۔ اور یاد رکھو، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی بیٹیوں، خاص طور پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تربیت میں یہی بنیاد رکھی، سادگی، ایمان اور قناعت۔ یہی وجہ ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی تھیں، دنیا کی چمک دمک کے باوجود انتہائی سادہ اور صابر زندگی گزاریں۔

کچھ دن بعد، حرا اپنی یونیورسٹی میں ایک لیکچر میں گئی

جہاں پروفیسر نے بچوں کی نفسیاتی تربیت پر بات کی۔ حرا کو یہ سن کر فوراً بی اماں کی باتیں یاد آئیں، کہ جدید نفسیات بھی وہی بات کہہ رہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیوں پہلے سکھائی۔

گھر آکر اس نے یہ بات بی اماں کو بتائی۔ بی اماں نے خوش ہو کر کہا، بیٹا، یہی وہ حکمت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کردار سے سکھائی۔ اور سوچو! سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹوں، حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی تربیت کیسے کی۔

وہ خود انتہائی نامساعد حالات میں، غربت اور سختی میں، اپنے بچوں کو صبر، قناعت اور اللہ پر بھروسا سکھاتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما جنت کے نوجوانوں کے سردار قرار پائے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا، یہ حدیث امام ترمذی نے روایت کی ہے۔

ایک اور موقع پر، حرا کی پھوپھی کے گھر ایک تقریب میں، اس نے دیکھا کہ اس کی چچی، جو بہت سخت مزاج تھیں، اپنے بچوں پر ہر بات پر چیخ چیخ چلاتی تھیں۔ بچے خوف زدہ اور سہمے ہوئے لگ رہے تھے۔ حرا نے یہ منظر بی اماں کو بیان کیا۔

بی اماں نے افسوس سے کہا، بیٹا، یہ تربیت کا غلط طریقہ ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے اپنے نواسے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بوسہ دیا، تو ایک صحابی نے حیرت سے کہا کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے تو کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ، جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے۔

اسی ہفتے، حرا کی یونیورسٹی میں اسلامیات کی استانی، ڈاکٹر ثمینہ، نے ایک اور اہم مثال دی۔ طلبہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کا بیٹا، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، تاریخ کا ایک اہم کردار ہے۔ ان کی والدہ نے انھیں بچپن سے حق کے لیے ڈٹ جانے کی تربیت دی۔ ایک روایت کے مطابق، جب حجاج بن یوسف کے محاصرے کے دوران عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا کہ حالات بہت سخت ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم حق پر ہو تو موت سے مت ڈرو۔

یہ واقعہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اور ایک اور عظیم مثال حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی ہے، اسلام کی پہلی شہیدہ، جنہوں نے اپنے بیٹے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے سامنے ہی ثابت قدمی سے اذیت برداشت کی اور اپنے ایمان پر جان دے دی۔

سوچو، اس ماں نے اپنے بیٹے کو زبانی نہیں، عملی طور پر سکھایا کہ ایمان جان سے بھی عزیز ہے۔

حرا نے دل چسپی سے پوچھا، میڈم، اور کیا کوئی مثال ہے جہاں ماں نے مشکل ترین حالات میں بھی اولاد کی تربیت نہ چھوڑی؟

ڈاکٹر ثمینہ نے جواب دیا، بالکل، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا واقعہ سب سے نمایاں ہے۔ ایک ویران صحرا میں، تنہا، اپنے شیر خوار بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ چھوڑی گئیں، مگر انہوں نے صبر اور توکل نہ چھوڑا۔ صفا اور مروہ کے درمیان ان کی دوڑ آج بھی حج کا حصہ ہے، اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایک ماں کی محنت اور توکل اللہ کے ہاں کتنا قیمتی ہے۔

اور حضرت آسیہ علیہا السلام، فرعون کی بیوی، نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی گود میں پالا، ایک ایسے ماحول میں جہاں کفر کا غلبہ تھا، مگر ان کا اپنا ایمان اور کردار تاریخ میں امر ہو گیا۔

کچھ دن بعد، حرا کی چھوٹی کزن، نور، پھر ان کے گھر آئی۔ اس بار وہ کھلونوں کی لڑائی پر رونے لگی۔ حرا نے اسے گود میں لے کر پیار سے سمجھایا، غصہ نہیں دکھایا۔ بی اماں نے یہ منظر دیکھا اور کہا، بیٹا، تم نے ابھی جو کیا، یہی حقیقی تربیت ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کا واقعہ یاد آتا ہے، جن کا بیٹا فوت ہو گیا تھا، مگر انھوں نے یہ خبر اپنے شوہر کو اس وقت تک نہ دی جب تک انھوں نے کھانا کھا نہ لیا۔

بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے ان کے صبر کی تعریف کی، اور دعا دی۔ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے۔

ایک اور دن، حرا کے ابو نے دسترخوان پر ایک اہم بات کہی۔ بیٹا، تربیت میں سب سے اہم چیز والدین کا اپنا عمل ہے۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی اپنے بچے کو بلا کر کہنے لگے، آؤ، میں تمہیں کچھ دوں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کیا دینے کا ارادہ ہے؟

صحابی نے کہا، کھجور۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر تم کچھ نہ دیتے تو یہ تمھارے لیے ایک جھوٹ لکھا جاتا۔ یہ حدیث ابوداؤد میں ہے۔

حرا نے یہ سب باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کیں۔ رات کو اس نے لکھا: تربیت کوئی الگ سبق نہیں جو ایک دن پڑھایا جائے، یہ ہر لمحے کا عمل ہے۔ حضرت مریم کی والدہ، حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ، حضرت اسماء، حضرت سمیہ، حضرت ہاجرہ، حضرت آسیہ، حضرت ام سلیم، ان سب نے مجھے سکھایا کہ ماں کا کردار محض پرورش نہیں، یہ ایک پوری نسل کی بنیاد رکھنے کا عمل ہے، چاہے حالات آسان ہوں یا سب سے کٹھن۔

اگلی صبح، ناشتے کی میز پر بی اماں نے حرا سے پوچھا، بیٹا، اب بتاؤ، ماں بننا تمہیں بوجھ لگتا ہے یا ذمہ داری؟

حرا نے مسکرا کر جواب دیا، نانی، پہلے شاید بوجھ لگتا، مگر اب سمجھ آیا کہ یہ تو امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التحریم میں فرمایا، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ اگر آج سے میں خود کو تیار کروں، سیکھوں، سمجھوں، تو کل جب اللہ مجھے یہ امانت دے گا، میں اسے بہتر طریقے سے نبھا سکوں گی۔ بی اماں کی آنکھوں میں فخر کی چمک آگئی۔ انہوں نے حرا کا ماتھا چوما اور آہستہ سے کہا، یہی وہ سمجھ ہے بیٹا، جو ایک عام لڑکی کو ایک باشعور، تیار مؤمنہ بناتی ہے، ایسی ماں جو حضرت ہاجرہ کے صبر، حضرت فاطمہ کی قناعت، اور حضرت اسماء کی ہمت لیے، آنے والی نسل کے لیے روشنی کا مینار ہوگی۔

■■■■■

(ص:33 کا بقیہ) جب کہ دوسری طرف، وانگچک کی بھوک ہڑتال کو قومی میڈیا کی طرف سے بھی بھرپور کوریج دی گئی۔

اسی وقت، ائیسا کی خامیاں یہ تھیں کہ وہ ادیتی مشرا جے این یو اسٹوڈنٹس یونین کی صدر اور ائیسا کی ایک اہم رہنما کو فعال طور پر شامل رکھنے میں ناکام رہی، اور ساتھ ہی انھیں وہ نمائندگی اور جگہ نہیں دی جس کی وہ حق دار تھیں۔

جنتر منتر کے احتجاج سے پہلے، راہل گاندھی واحد قومی رہنما تھے جو ان مسائل پر ائیسا اور نیہا بورا جیسے رہنماؤں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے۔ ان کا یہ تبادلۂ خیال ایک گہرے نظریاتی ہم آہنگی کی عکاسی کرتا تھا۔ تاہم، سی جے پی نے بار بار ائیسا کو حاشیے پر دھکیلنے کی کوشش کی، جس سے اس بات کو تقویت ملی کہ یہ کیجریوال کے سیاسی رجحانات کو ہی آگے بڑھا رہی ہے۔

NEET کے امتحانات میں بے ضابطگیوں، تعلیمی پالیسی کی تبدیلیوں (NEP 2020)، اور اعلیٰ تعلیم کی زعفرانی کاری (Saffronization) جیسے مسائل کو قومی سطح پر لانے کا کام بنیادی طور پر نیہا بورا، راہل گاندھی اور ان کے حلیفوں کی کوششوں سے ہوا ہے۔ 'اے آئی ایس ایف' (AISF-آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن)، جو کہ سی پی آئی (CPI) کی طلبہ تنظیم ہے، نے بھی حمایت حاصل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان تمام باتوں سے جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بھارتی سیاست اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے جو بائیں بازو، جمہوری، سیکولر اور سوشلسٹ تحریک کے لیے سازگار ہے، جو کسانوں، اقلیتوں، آدیواسیوں، دلتوں، مزدوروں اور زمین کے حقوق کی جدوجہد کو متحد کرتی ہے۔ Gen-Z کے جنتر منتر احتجاج کا سبق واضح ہے کہ ہندوتوا فاشزم بالآخر ایسی تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاریخ اس احتجاج کو ایک عظیم امید کے لمحات کے طور پر محفوظ رکھے گی۔ جہاں Gen-Z نے پرانی نسلوں سے بھی زیادہ آئینی اقدار کے ساتھ وابستگی دکھائی، اور جمہوریت کے حقیقی مفہوم کو بچانے کی کوشش کی۔ ■

نقد و نظر

مکتوبات حافظ بخاری کی تاریخی اور ادبی جہتیں

تبصرہ نگار: توفیق احسن برکاتی، استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

"خطوط نگاری" کی روایت زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ قرآن مجید میں ملکہ سبا کے نام حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کا تذکرہ ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدّد سلاطین کے نام دعوتی خطوط روانہ فرمائے اور خود ان کے پاس بھی تحریری عرض داشتیں آئیں۔ بعد کے ادوار میں اس صنف کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ خلفا، امرا، سلاطین، اربابِ تدبیر اور صاحبان علم ودانش کے خطوط کا ایک بڑا سرمایہ تاریخ ادب میں محفوظ ہے۔ فارسی میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے دعوتی خطوط کا مجموعہ "مکتوباتِ امام ربانی" اور مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے مکاتیب کا مجموعہ "مکتوباتِ صدی" کافی اہمیت رکھتے ہیں جن کا اردو ترجمہ مطبوع ہے۔ اردو زبان میں مکتوباتی ادب کا قابل قدر سرمایہ ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی تلاش وتحقیق کی رو سے اردو کا پہلا خط 1803ء کا مکتوبہ ہے اور اردو کا پہلا مطبوعہ خط 1865ء کا ہے۔ اردو میں خطوط نگاری کا تاریخی وادبی ارتقا ایک تحقیقی موضوع ہے جس پر گفتگو کسی اور موقع پر ہوگی۔ اس مقام پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اردو میں مکتوباتی ادب کی عمر دو سو برس سے متجاوز ہو چکی ہے۔ اس دوران متعدّد علما، مشائخ، شعرا، ادبا، محققین، ناقدین کے کئی درجن مجموعہائے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں رجب علی بیگ سرور، غالب، اقبال، امیر مینائی، داغ، امام احمد رضا، سرسید، شبلی وغیرہ کے خطوط باضابطہ مدون ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اردو کے قدیم خطوط کی تلاش وتحقیق کا بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر آرزو خطوط کی ادبی و تاریخی اہمیت کو سمجھتے تھے اور انھیں جمع کرنے کا جنونِ شوق رکھتے تھے۔

انھوں نے اپنے نام بیشتر خطوط شائع کر کے محفوظ کر دیے۔ ان کی زندگی میں ان کے خطوط کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے جن کی تفصیل ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مضمون "مکتوباتی سرمایہ ادب اور مختار الدین احمد" میں دی ہے۔ ایک محتاط تحقیق کے مطابق ڈاکٹر مختار الدین احمد کے خطوط کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچتی ہے، ایک خط راقم سطور (احسن برکاتی) کے نام بھی ہے۔ مکتوباتی ادب پر ڈاکٹر شمس بدایونی کا تحقیقی کام بھی قابل قدر ہے۔ نقوش، لاہور نے 1957ء اور 1968ء میں دو الگ الگ خطوط نمبر شائع کیے، جس میں مکتوباتی ادب کی تحقیق کا وافر مواد موجود ہے۔

امام احمد رضا قادری کے علمی وادبی خطوط کا بھی ایک بڑا سرمایہ محفوظ ہے۔ جس پر متعدّد محققین نے کام کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے "کلیات مکاتیب رضا" کی دو جلدیں اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کرائی ہیں۔ رئیس القلم علامہ ارشد القادری کے علمی وادبی خطوط کا ضخیم مجموعہ "برید مشرق" ڈاکٹر خوشتر نورانی کی تحقیق وتدوین وحواشی کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

"مکتوباتِ حافظ بخاری" مکتوباتی ادب کی تاریخی روایت کا ایک سنگ میل ہے۔ یہ حافظ بخاری خواجہ سید عبدالصمد چشتی قدس سرہ کے علمی، دعوتی اور اصلاحی خطوط کا مجموعہ ہے جس کی تلاش وتدوین محترم مولانا عابد چشتی (استاذ جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف) نے بڑی ادبی نفاست کے ساتھ کی ہے۔ ایک سو بہتر صفحے کی اس کتاب میں چالیس سے زائد مکاتیب شامل ہیں جن کی انجمن میں حضرت حافظ بخاری کے شخصی کوائف، ان کی مذہبی، علمی، دعوتی، تنظیمی اور معاشرتی سرگرمیوں، روحانی وقار اور

معاصر علمی حلقوں میں ان کا قدر و منزلت کے نقوش منعکس ہوتے ہیں۔ مشاہیر علما اور متعلقین کے چند خطوط بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ خطوط کی زبان انتہائی سہل، شگفتہ اور فہم مطالب میں کافی معاون ہے۔

حافظ بخاری خواجہ سید عبدالصمد چشتی سہسوانی ہندوستان کی علمی و روحانی تاریخ کا ایک نمایاں نام ہے۔ جنھوں نے تاج الفحول علامہ عبدالقادر بدایونی اور علامہ فضل رسول بدایونی علیہما الرحمہ جیسے اساطین علم و معرفت کی بارگاہِ فیض سے خوشہ چینی کی اور فائق الاقران ہوئے۔ مدرسہ قادریہ میں باضابطہ تدریس کا کام کیا۔ معاصر علما و مشائخ سے ان کے گہرے روابط رہے اور باطل تحریکوں، فتنوں اور اسلام مخالف سازشوں کو ناکام بنانے میں اپنی علمی طاقت خرچ کی۔ تحریک ندوہ کے خلاف ان کی مساعی جمیلہ تاریخ کا حصہ ہے۔ ندوہ کی تردید و مخالفت میں سنی علما و مشائخ نے جب "مجلس علماے اہل سنت" تشکیل دی تو اس کا صدر الصدور آپ ہی کو بنایا گیا۔ تاکہ ان کی صدارت میں ملک گیر سطح پر ندوہ کی گمراہیوں کے خلاف تحریک چلائی جائے اور اس کے دام فریب سے عوام و خواص سے بچایا جائے۔ ان کا اپنا حلقۂ ارادت تھا جنھیں وہ عرفانی شعور بانٹتے اور ان کے باطن کی اصلاح کا فریضہ نبھاتے۔ گمراہ کن افکار کی تردید وابطال میں کئی اہم کتابیں ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ محض سترہ برس کی عمر میں مولوی امیر حسن سہسوانی کی کتاب کے رد میں "افادات صمدیہ" لکھی جو 1285ھ میں شائع ہوئی۔ اور 1286ھ میں اسی کتاب کے مندرجات پر مولوی امیر حسن سے مناظرہ کیا اور شکست فاش دی۔ شیعی افکار کے رد میں "ارغام الشیاطین فی تردید متعة الشیعین" نامی کتاب تحریر کی۔ اس کے علاوہ بھی کئی اہم، مفید اور معرکہ آرا کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

ان کا حافظہ بڑا قوی اور شفاف تھا، ذہن اخاذ پایا تھا اور علمی و روحانی امانتوں کے امین تھے۔ قرآن مجید، صحیح بخاری اور حصن حصین کے حافظ تھے۔ معاملہ فہمی، نکتہ رسی، زمانہ شناسی اور اعلیٰ تدبیر میں انھیں کمال حاصل تھا، ان خوبیوں کا گہرا اثر ان کی زبان و قلم اور تحریر و تقریر میں نظر آتا تھا۔ خواص کی مجلسوں میں ان کی گفتگو کا جو انداز ہوتا تھا بزمِ عوام بھی وہی سلجھی ہوئی تقریر فرماتے تھے اور دلائل و براہین سے اپنا مدعا پیش کرتے تھے۔ مجلس علماے اہل سنت کے اجلاس میں ان کا جو صدارتی خطاب ہوتا تھا اس کا لفظ لفظ بغور سنا جاتا تھا۔ وقت کے مقتدر اساتذہ و علما انھیں اپنی دینی مجالس میں بطور خطیب مدعو کرتے تھے اور نیاز بجا لاتے تھے۔ جیساکہ استاذ مطلق علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی آثار کے امین، استاذ الاساتذہ علامہ ہدایت اللہ رام پوری کے خط سے عیاں ہوتا ہے۔ حافظ بخاری اور علامہ کے درمیان انتہائی مخلصانہ روابط رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے علمی و روحانی کمال کے معترف و مداح تھے۔ علامہ کے قابل فخر شاگردوں میں ایک بڑا نام خود شہزادۂ حافظ بخاری خواجہ سید شاہ مصباح الحسن چشتی علیہ الرحمہ کا آتا ہے۔ علامہ ہدایت اللہ رام پوری نے حافظ بخاری کو اپنے یہاں منعقدہ محفل رجبی شریف میں حاضری اور خطاب کا عریضہ ارسال کیا۔ حافظ بخاری علیہ الرحمہ نے منظوری کا جوابی خط روانہ فرمایا۔ جس میں یہ چشم کشا اور دل پذیر جملے بھی ہیں: "حضرتا! حاضر ہونا کیسا، میں حضرت کو دیکھنے کو اور حضور میں حاضر ہونے کو اپنی عبادت سمجھتا ہوں۔" ... "جس تاریخ، جس روز، جس وقت کو حکم ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور حاضر ہوں گا۔ ہاں! اس قدر ضرور عرض ہے کہ میں ایک وحشی طبیعت کا آدمی ہوں، جب تک حاضر رہوں کوئی جگہ تخلیہ کی عنایت فرما دی جائے۔" (ص:89،90)

منظوری کا والا نامہ ملنے کے بعد خوشیوں سے سرشار جوابی خط میں علامہ کے یہ جملے انتہائی قابل مطالعہ ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

(باقی ص:53 پر)

خیابان حرم

تقدیسی ترانے

نعت رسول ﷺ

حمد لک میں کوچہ سرکار میں آیا
اب اوج مقدر مرا اظہار میں آیا

دنیا نے مجھے جان لیا بَردہء آقا
بکنا مرا آنکھوں کے ہر اخبار میں آیا

پہلا ہی قدم راہ مدینہ میں اٹھا ہے
لگتا ہے کسی بقعۂ انوار میں آیا

خود خاک شفا دینے شفا آ گئی نزدیک
جب ان کا تصور دل بیمار میں آیا

پنکھڑیوں نے جب اسم نبی ہونٹ پہ رکھا
خوشبو کا اثاثہ گل ایثار میں آیا

پھر دشت غزل بارش تطہیر میں بھیگا
پھر نعت کا اک شعر دل یار میں آیا

کلیوں نے پڑھا کِھل کے درودوں کا ترانہ
ذکر ان کے تبسم کا جو گلزار میں آیا

سرکار کی آہستہ خرامی کے تصدق
چلنے کا ہنر ثابت و سیار میں آیا

جس کا نہ کوئی عکس نہ جس کی ہے کوئی مثل
وہ پھول براہیم کے گلزار میں آیا

کانٹوں نے کیے زیب بدن پھول لبادے
یہ کون مری وادی پرخار میں آیا

جب خاک مدینہ سے دیا غسل تو یاور
توقیر کا پہلو مری دستار میں آیا

علامہ یاور وارثی کانپوریوپی

نعت رسول ﷺ

لوحِ دل پر ہو گئی ہے منعکس تابِ ثنا
یعنی اب مجھ پر بھی وا ہو جائے گا بابِ ثنا

مستقل ملحوظ رکھ "لَاتَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ"
پے بہ پے ہو جائے گی تفہیمِ آدابِ ثنا

اُن کی جانب سے ملی ہے نو بہ نو فکری کمک
ورنہ ممکن ہی کہاں تسخیرِ احزابِ ثنا؟

سازِ عشقِ شاہ کا ہر تار یکسر چھیڑ دے
بربطِ دل پر اگر پڑ جائے مضرابِ ثنا

بحرِ حسنِ ذوق اگر تیرا تلاطم خیز ہو
لفظ کے ہر سیپ میں ہے دُرِّ نایابِ ثنا

فکر و فن کے زاویے یک لخت روشن ہو گئے
مطلعِ امکان پر چمکا جو مہتابِ ثنا

جوہرِ جاوید ہر دو آب میں موجود ہے
چاہے وہ آبِ بقا ہو ، چاہے وہ آبِ ثنا

جب کبھی ثاقؔب متاعِ کیف کی حاجت ہوئی
نطق کی زنبیل میں آیا زرِ نابِ ثنا

ثاقب قمری مصباحی

خراج عقیدت دربارگاہ اعلیٰ حضرت

ہر اک غلام نبی کی زباں پہ نام رضا
نبی کے عشق نے اونچا کیا مقام رضا

یہ احترام حبیب خدا کا تحفہ ہے
سجا ہوا ہے زبانوں پہ جو سلام رضا

رضائے سرور عالم متاع ہستی ہے
اسی لیے تو پلایا رضا نے جام رضا

جو باوفا رہے ان کو محبتوں کے گلاب
عدوِّدیں کے لیے تیغ بے نیام رضا

ہو صرف و نحو و تصوف بدیع و فن عروض
ہر ایک علم میں واضح رہا مقام رضا

کمال فلسفۂ و منطق و معانی میں
کہ شش جہات سے روشن رہا مشام رضا

قدآوروں نے تو تسلیم کر لیا لیکن
یہ بونے ناپ رہے ہیں ابھی مقام رضا

بفیض حضرت اختر رضا یہ خواہش ہے
فرشتے حشر میں کہہ دیں مجھے غلام رضا

نہ تم کو باد مخالف کی فکر ہو اظہؔر
جہاں میں عام کرو اس طرح پیام رضا

نعمان اظہؔر مصباحی سنبھلی

سفر آخرت

سانحۂ ارتحال اور تعزیتی تحریریں

مفتی عبدالقدوس مصباحی کا وصال اہل سنت کے علمی حلقوں کے لیے بڑا نقصان

از: حضرت علامہ عبدالحفیظ مصباحی، سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے قابل فخر فرزند، حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے ممتاز شاگرد، باعمل، باوقار اور مخلص عالم دین حضرت مفتی عبدالقدوس مصباحی رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کی خبر سن کر دلی صدمہ پہنچا۔ آپ کی رحلت نہ صرف اہل خانہ بلکہ جامعہ اشرفیہ، تلامذۂ حافظِ ملت اور اہل سنت کے علمی حلقوں کے لیے بڑا نقصان ہے۔ موصوف نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس، اصلاح و تبلیغ، فتویٰ نویسی، علمِ دین کی ترویج و اشاعت اور دینِ متین کی خدمت میں صرف کردی۔

اس غم کے موقع پر ہم اہل خانہ، متعلقین، شاگردوں اور تمام سوگواران کی خدمت میں دلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی عبدالقدوس مصباحی کی دینی، علمی اور تدریسی خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند سے بلند تر کرے، ان کی قبر کو بقعۂ نور بنائے اور انھیں اپنے محبوب بندوں کے ساتھ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ربِّ کریم تمام اہل خانہ اور پسماندگان کو صبرِ جمیل، حوصلۂ کامل اور اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین، بجاہِ سید المرسلین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

(عبدالحفیظ عفی عنہ)

سربراہِ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

13 صفر 1448/28 جولائی 2026ء

مفتی مسیح احمد مصباحی باوقار عالمِ دین اور خوش اخلاق انسان تھے

از: حضرت مفتی بدر عالم مصباحی، صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

دل پر رنج والم کے بادل اس وقت مزید گہرے ہو جاتے ہیں جب علم و فضل، اور اخلاص و خدمت کا کوئی روشن چراغ بجھ جاتا ہے۔ ایسی ہی اندوہناک خبر ہمیں حضرت مفتی مسیح احمد قادری مصباحی کے وصال کی ملی۔ اس خبر نے اربابِ علم و دانش، فرزندانِ اشرفیہ اور تلامذہ و متعلقین کے دلوں کو غم سے نڈھال کردیا۔

حضرت مفتی مسیح مصباحی ایک باوقار عالمِ دین، سنجیدہ مفتی، باعمل داعی اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی دینِ متین کی خدمت، سنتِ نبوی کی اشاعت، مسلکِ اعلیٰ حضرت کی ترجمانی اور عوام کی علمی و شرعی رہنمائی میں گزری۔ وہ علم کے ساتھ حلم، وقار، انکساری اور حسنِ اخلاق کا حسین امتزاج تھے۔ ان کی مجلس علم و حکمت کا گہوارہ، ان کی گفتگو اخلاص کی آئینہ دار اور ان کا کردار لائقِ اتباع تھا۔

حضرت مفتی مسیح احمد قادری مصباحی کا وصال یقیناً علمی و دینی حلقوں کے لیے ایک ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی آسان نہیں۔ اگرچہ اہل علم اپنے علمی آثار، تربیت یافتہ شاگردوں اور دینی خدمات کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، تاہم ان کی جسمانی جدائی دلوں کو

غمگین اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو علم، فہم اور خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائی، وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے لیے صدقۂ جاریہ اور رفعِ درجات کا ذریعہ بنے گی۔

اس جانکاہ سانحۂ ارتحال پر جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے سربراہِ اعلیٰ عزیزِ ملت علامہ شاہ عبد الحفیظ مصباحی دامت برکاتہم العالیہ، ان کے شہزادے حضرت مولانا نعیم الدین عزیزی اور اساتذۂ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، حضرت کے تمام اہل خانہ، متعلقین، تلامذہ اور عقیدت مندوں کی خدمت میں دلی تعزیت و ہمدردی پیش کرتے ہیں۔

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اپنے فضل و کرم سے مرحوم کی کامل مغفرت فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر کرے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے، اپنی جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کی دینی و علمی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے، اور تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل، اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ، وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ مَأْوَاهُ، وَأَلْهِمْ أَهْلَهُ وَذَوِيْهِ الصَّبْرَ وَالسَّلْوٰى. آمین یا رب العالمین۔

8 صفر 1448ھ/23 جولائی 2026ء

مفتی مسیح احمد قادری مصباحی کا سانحہ ارتحال علمی و روحانی دنیا کا عظیم خسارہ

مولانا ضیاء المصطفیٰ نظامی، سنت کبیر نگر

عظیم علمی و روحانی شخصیت، علامہ مفتی مسیح احمد قادری مصباحی (سابق صدر المدرسین و شیخ الحدیث جامعہ انوار القرآن، بلرام پور) 22 جولائی 2026ء مطابق 7 صفر 1448ھ کو اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ رٰجعون۔ آپ کے وصال کی خبر سے دینی و علمی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔

مفتیِ مسیح ملت علیہ الرحمہ کی ولادت 19 فروری 1964ء کو زکریا اسٹریٹ، کولکاتا کے ایک مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ آپ نے اپنی والدہ ماجدہ سے ناظرہ اور قاری محمد اشرف بہاری سے صرف 13 سال کی عمر میں حفظِ قرآن مکمل کیا۔

تکمیلِ حفظ کے بعد جامعہ انوار القرآن بلرام پور میں داخلہ لیا، داخلے کے فوراً بعد، حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ آنکھ کے آپریشن کے سبب بلرام پور تشریف لائے۔ ڈاکٹروں کے پڑھنے سے منع کرنے پر انھوں نے قرآن سننے کی خواہش ظاہر کی۔ اس خدمت کے لیے حضرت مفتی صاحب قبلہ کا انتخاب ہوا، جنہوں نے ایک ہفتے میں 14 پارے سنا کر حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی دعائیں حاصل کیں۔

جامعہ انوار القرآن اور جامعہ نعیمیہ (مراد آباد) میں ابتدائی و متوسط تعلیم کے بعد 1979ء میں ازہر ہند الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں داخلہ لیا اور فروری 1985ء میں ممتاز نمبرات سے سند و دستارِ فضیلت سے نوازے گئے۔ دورانِ تعلیم سرکار مفتیِ اعظم ہند قدس سرہ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ بعد ازاں عزیزِ ملت حضرت علامہ شاہ عبد الحفیظ مد ظلہ العالی (سربراہِ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ) نے آپ کو سلسلہ قادریہ برکاتیہ رضویہ عزیزیہ کی اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ فراغت کے بعد آپ نے: مدرسہ اہل سنت جامع العلوم میں بطور صدر المدرسین اور دار العلوم علیمیہ میں سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

1994 میں جامعہ انوار القرآن (بلرام پور) بحیثیت نائب شیخ الحدیث و مفتی، آپ کا تقرر ہوا اور 2006ء میں حضرت مفتی محمد اسلم بستوی علیہ الرحمہ کے وصول کے بعد صدر المدرسین و شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔

آپ کے تعمیری ذوق اور انتھک محنت کے نتیجے میں حافظ ملت لائبریری کی توسیع اور عزیزی دار المطالعہ کا قیام عمل میں آیا۔ مارچ 2026ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ بطور قاضیِ شہر بلرام پور امت کی شرعی رہنمائی فرماتے

رہے۔ 52 سال تک مسلسل تراویح میں ختم قرآن کا سلسلہ برقرار رکھا۔ ہزاروں فتاویٰ صادر فرمائے۔ اور 18 سال سے ماریشس (افریقہ) میں اہل سنت و جماعت کی ترویج و اشاعت کے لیے جشن عید میلاد النبی کی قیادت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

نبیرہ خطیب البراہین مولانا ضیاء المصطفیٰ نظامی ولی عہد خانقاہ نظامیہ اگیا شریف نے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”حضرت مفتی صاحب شاندار حافظ، باکمال مدرس، ماہر مفتی، صاحبِ طرز ادیب اور خلوص و تواضع کے پیکر تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اشاعت دین و سنیت کے لیے وقف کر رکھی تھی اور ہزاروں علما و ائمہ کی تربیت فرمائی۔ بلاشبہ آپ گلشنِ عزیزی کے وہ گلِ خوش رنگ تھے جس کی نکہت سے بے شمار قلوب و اذہان معطر ہوئے۔ ان کا وصال ملتِ اسلامیہ کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے، ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے، انھیں شمیمِ جنت کی راحتیں نصیب فرمائے اور تمام پس ماند گان و متعلقین کو صبرِ جمیل و اجرِ جزیل عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

مولانا کوثر مصباحی غازی پوری داغ مفارقت دے گئے

محمد عارف رضا نعمانی مصباحی۔ چریاکوٹی

مولانا جاوید مصباحی گلبرگہ شریف کے ذریعے جواں سال عالم دین مولانا کوثر مصباحی غازی پوری کی علالت کی خبر موصول ہوئی، جو پچھلے کئی سالوں سے پہلے حیدرآباد میں دارالعلوم فیض رضا شاہین نگر حیدرآباد پھر گلبرگہ شریف میں بحیثیت خطیب و امام فاطمہ مسجد، مسلم کالونی، و مدرسہ فیضِ مصطفیٰ للبنات میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کی علالت کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نمونیہ، ٹائیفائڈ، ڈینگو اور دمہ جیسی کئی شکایتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی ہیں اور دس روز سے آئی سی یو میں زیر علاج ہیں، اس سخت علالت کی خبر نے ہی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا کہ اس کے ایک روز بعد یعنی 5 محرم الحرام 1448ھ مطابق 21 جون 2026ء کو ان کی رحلت کی خبر موصول ہوئی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، پھر کیا تھا کہ ایک دم سے غم و اندوہ کی کیفیت چھا گئی، اور دیر تک باقی رہی، نگاہوں میں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ بار بار پھر رہا تھا، مولانا کوثر صاحب بڑے خوش اخلاق، نیک طبیعت کے مالک تھے، آپ کی فراغت سن 2009ء میں ہوئی، جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں مجھ سے کافی سینیر ہونے کے باوجود بڑے تپاک سے ملتے اور خوش روئی کے ساتھ گفتگو فرماتے، ہماری ایک دوسرے سے انسیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے پڑوس کے شہر غازی پور سے تعلق رکھتے تھے، "نَوَّرَ اللہُ مَرقَدَہ"

دو سال قبل جون ہی کے مہینے میں حیدرآباد میں ایک مقام پر ملاقات ہوگئی اور اچھی ملاقات رہی، خیریت اور مصروفیات کے بارے میں گفتگو ہوئی تو بتایا کہ اب حیدرآباد سے گلبرگہ شریف منتقل ہو گیا ہوں، ایک دو روز میں گلبرگہ شریف جانا ہے، اتفاق سے ہمیں بھی حیدرآباد سے گلبرگہ شریف جانا تھا لیکن حیدرآباد کی ملاقات اچھی رہی اس لیے گلبرگہ شریف میں ملاقات کرکے زحمت دینے کی کوشش نہیں کی، کیا خبر تھی کہ انھیں اس جوانی میں ہی پیک اجل کو لبیک کہنا پڑے گا، یوں تو موت برحق ہے، ہر جاندار کو اس کا مزہ چکھنا ہے، لیکن جوانی کی موت یقیناً جھنجھوڑ دیتی ہے، اور بڑی نصیحت ہوتی ہے، مولانا موصوف خدمت دین میں مصروف تھے، مولیٰ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور ان کی بلندی درجات کا باعث بنائے، اور ان کی بے حساب مغفرت فرمائے، پسماندگان اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ وافضل التسلیم، پسماندگان میں دو بچیوں کا علم ہوا ہے ان کے اور دیگر اہل خانہ کے لیے تعزیتی کلمات پیش ہیں۔

دعاے مغفرت اور مفتی محمد اعظم مصباحی کے اہل خانہ سے اظہار تعزیت

از: مولانا عبد المنان مصباحی، استاذ جامعہ اشرفیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

یہ ناگہانی خبر سن کر قلبی تکلیف پہنچی کہ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور کے معزز استاذ حضرت مولانا مفتی محمد اعظم مصباحی کی والدۂ ماجدہ کا انتقال 13 محرم الحرام 1448ھ، مطابق 29 جون 2026ء کو ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ. رَضِیْنَا بِاللّٰهِ تَعَالٰی رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا وَرَسُوْلًا.

اس الم ناک خبر سے الجامعۃ الاشرفیہ کے اساتذۂ کرام، طلبۂ عزیز اور جملہ وابستگانِ جامعہ انتہائی غم زدہ ہوئے۔ اسی روز بعدِ نمازِ ظہر مرحومہ کی نمازِ جنازہ ان کے آبائی وطن پاہی میں ادا کی گئی۔ نمازِ جنازہ کی امامت شہزادۂ حضور حافظِ ملت، حضرت عزیزِ ملت دامت برکاتہم العالیہ، سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے فرمائی۔ اس موقع پر الجامعۃ الاشرفیہ کے جلیل القدر اساتذہ، طلبہ، قرب و جوار کے علما، حفاظ، قرا اور عوام و خواص نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت اور اہل خانہ سے اظہارِ تعزیت کیا۔

حضرت صدر المدرسین صاحبِ قبلہ -دام ظلہ العالی- جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، جوان دنوں سفر پر تھے، واپسی کے بعد دوسرے روز بعدِ نمازِ مغرب نبیرہ حضور حافظِ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان حضرت نعیم ملت دامت برکاتہم العالیہ کے ہمراہ حضرت مولانا مفتی محمد اعظم مصباحی کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے، تعزیت و دلجوئی فرمائی، مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب کیا اور ان کی مغفرت و رفعتِ درجات کے ساتھ اہل خانہ کے لیے صبرِ جمیل، اجرِ جزیل کی دعا فرمائی۔

اسی موقع پر حضرت مولانا کے والد محترم جناب عبد الجبار اعظمی، برادرِ صغیر ماسٹر محمد معظم (پرنسپل، ڈگری کالج سٹھیاؤں)، برادرِ اصغر محمد مکرم اور دیگر اہل خانہ سے بھی اظہارِ تعزیت اور صبر و استقامت کی دعا کی گئی۔

والدۂ محترمہ کا سایۂ شفقت اٹھ جانا زندگی کے عظیم ترین صدمات میں سے ایک ہے، مگر بندۂ مؤمن کی شان صبر و رضا اور مشیتِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور اس غم کی گھڑی میں مفتی محمد اعظم مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اور ان کے تمام اہل خانہ کے ساتھ برابر شریکِ غم ہے اور بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، کامل مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، ان کی قبر کو نور و راحت کا گہوارہ بنائے اور تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل، اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین والحمد للہ ولی التوفیق.

مفتی محمد اعظم مصباحی کی والدہ محترمہ کا وصال —ایک دردمندانہ تعزیت

از: مولانا رحمت اللہ مصباحی، نمائندہ روزنامہ انقلاب، مبارک پور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

ماں صرف ایک رشتہ نہیں، بلکہ رحمت، محبت، ایثار، دعا اور شفقت کا گھنا شجر ہے جس کے سائے میں انسان عمر بھر آسودگی محسوس کرتا ہے۔ جب یہ سایۂ عاطفت اٹھ جاتا ہے تو زندگی کا ایک روشن باب خاموشی سے بند ہو جاتا ہے، مگر اس کی دعاؤں کا نور، اس کی تربیت کے اجالے اور اس کی محبت کی حرارت ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہے۔

حضرت مفتی محمد اعظم مصباحی استاذِ جامعہ اشرفیہ اور ماسٹر محمد معظم پرنسپل ماں پر بھاوتی پی جی کالج سٹھیاؤں صاحبان کی والدۂ ماجدہ کے وصال کی اندوہ ناک خبر نے دل کو بے حد مغموم کر دیا۔

یہ صدمہ صرف ایک گھرانے کا نہیں بلکہ ہر اس شخص کا غم ہے جو اہلِ علم کی عظمت، ماؤں کی قربانیوں اور دینی خانوادوں کی خدمات کی قدر کرتا ہے۔ یقیناً ایک صالحہ ماں کی خاموش دعائیں ہی وہ سرمایہ ہوتی ہیں جس کے سہارے اولاد علم و عمل کے آسمان پر رفعتوں کی منازل طے کرتی ہے۔ ایسی بافیض ہستی کا اس دنیا سے رخصت ہونا ایک ایسا خلا ہے جسے زمانہ بھی آسانی سے پُر نہیں کر سکتا۔ اس غمِ عظیم کے موقع پر ہم مذکورہ دونوں حضرات، تمام اہلِ خانہ، اعزہ و اقربا، تلامذہ اور متعلقین کی خدمت میں نہایت دردمندانہ تعزیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبرِ جمیل، رضا بالقضا اور اجرِ عظیم کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ حق تعالیٰ اس آزمائش کو آپ کے درجات کی بلندی، گناہوں کی مغفرت اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بنائے۔

بارگاہِ ربِّ ذوالجلال میں عاجزانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ مغفورہ کو اپنی بے پایاں رحمت کے سائے میں جگہ عطا فرمائے، ان کی کامل مغفرت فرمائے، ان کے حسنات کو شرفِ قبولیت بخشے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور روزِ قیامت اپنے حبیبِ مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شفاعتِ عظمیٰ سے بہرہ مند فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین کا مقام عطا فرمائے۔ ربِ کریم اہلِ خانہ کے دلوں کو اپنی یاد سے سکون عطا فرمائے، انھیں اس عظیم صدمے پر بہترین صبر نصیب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔ والسلام مع الدعا

(ص:48 کا بقیہ) "گرامی نامہ، نہیں نہیں، میری مغفرت کا پروانہ عین حالت انتظار میں وارد ہوا، سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا، پڑھا اور ارمان کی طرح دل میں رکھ لیا، پھر ارمان نکلنا کچھ آسان تو تھا نہیں لہٰذا جواب میں تاخیر ہوئی۔ الحمد للہ والصلاۃ علی رسول اللہ کہ حضرت نے اس ہیچ میرز کی التجا قبول کی، نازم بر بخت خویش۔ مولائی! آپ کی قبولیت تو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی منظوری بتلا رہی ہے۔" (ص:۹۱)

خواجہ سید عبدالصمد چشتی علیہ الرحمہ نے مختلف مواقع پر اپنے احباب اور معاصرین کو خطوط روانہ فرمائے۔ ندوہ کے مسئلے میں بانی تحریک مولانا محمد علی مونگیری کے نام ان کی مکاتیب کی اچھی خاصی تعداد ہے جن کا مطالعہ ندوہ کی گمراہیوں اور آزادیِ فکر کی آوارگی کی پرتیں کھولتا ہے اور حضرت حافظ بخاری کی تاریخی کوششوں کے نقوش ذہن و فکر میں بیٹھ جاتے تھے۔ مولانا عابد چشتی زید مجدہ نے ان خطوط کی موضوعاتی جہتوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس مجموعہ کا زیادہ تر حصہ تحریک ندوہ اور اس کے بانی مولانا محمد علی مونگیری کے درمیان آپ کی اصلاح پسندانہ کوششوں کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے بعد فتنۂ شش مثل، فتنۂ منکرین میلاد اور کچھ احباب و متعلقین کی اصلاح و تربیت کا احاطہ کرتا ہے۔

فاضل مرتب نے بیس صفحات میں ایک طویل مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے اور اخیر میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہم کے مختصر احوال بھی درج کیے ہیں، جو خط جہاں سے ماخوذ ہے اس کا پورا حوالہ دیا ہے۔ یوں یہ کتاب مکتوباتی ادب کی ایک تاریخی دستاویز بن گئی ہے جس میں اس دور کی مذہبی تاریخ کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے، ساتھ ہی حضرت خواجہ سید عبدالصمد چشتی سہسوانی علیہ الرحمہ کے اعلیٰ احوال و اخلاق اور ان کے دینی و علمی و دعوتی کارناموں کی جھلکیاں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ کیوں کہ خطوط انسان کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ مکتبہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اتر پردیش سے یہ مجلد کتاب ۱۴۴۷ھ مطابق ۲۰۲۵ء میں طبع ہوئی ہے۔ مرتب و ناشر کو بہت بہت مبارک باد۔ ■■■

صدائے بازگشت

تزکیۂ نفس اور تعلیمات نبوی

مکرمی! انسان کا وجود مٹی اور روح کے ایک ایسے پراسرار امتزاج کا نام ہے، جس میں خاکی بدن اسے پستی کی طرف کھینچتا ہے اور ربانی روح اسے بلندیوں کی جانب پکارتی ہے۔ اس کشمکش میں انسانی بقا اور ارتقا کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی باطنی دنیا کو کس حد تک آلودگیوں سے بچا کر اس کی اصل فطرت پر قائم رکھتا ہے۔ اسلام کی اخلاقی اور روحانی لغت میں اسی عمل کو تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ثانوی درجے کی صوفیانہ مشق یا محض طریقت کا کوئی اضافی سبق نہیں، بلکہ قرآنِ حکیم کی رو سے یہ بعثتِ انبیا کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ سورۂ جمعہ میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان میں آیات کی تلاوت کے فوراً بعد تزکیہ کا ذکر آیا ہے، جس کے بعد کتاب اور حکمت کی تعلیم کا بیان ہے۔ جیساکہ فرمان باری تعالیٰ ہے :هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ . (پ:28.آیت:2)

ترجمہ : وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انھیں پاک کرتے ہیں اور انھیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں اور بے شک وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔ (کنزالایمان).

اس قرآنی ترتیب سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرمانے کے بعد انھیں پاک کرتے ہیں "یعنی انھیں باطل عقیدوں، مذموم اخلاق، قبیح عناصر، دور جاہلیت کی خباثتوں اور ناپسندیدہ اعمال سے پاک کرتے ہیں "اس کے بعد انھیں کتاب و حکمت یعنی قرآن و سنت اور شریعت و طریقت کے احکام و اسرار کا علم عطا فرماتے ہیں"۔ اس سے پتہ یہ چلا کہ جب تک دل کا برتن پاک نہ ہو، اس میں علم اور حکمت کا نور نہیں ٹھہر سکتا، گویا تزکیہ وہ اولین شرط ہے جو انسان کو وحی (قرآن وسنت) کے فہم کے قابل بناتی ہے۔

لغوی اعتبار سے تزکیہ کے دو بنیادی مفہوم ہیں: پاک وصاف کرنا اور نشوونما دینا۔ جس طرح ایک ماہر باغبان کسی پودے کی بہترین افزائش کے لیے اس کے گرد اگی ہوئی خودرو جڑی بوٹیوں اور خاردار جھاڑیوں کو کاٹ دیتا ہے تاکہ پودا پوری طرح پنپ سکے، بالکل اسی طرح تزکیہ کا عمل انسانی روح کو حسد، تکبر، کذب و دغا، ریاکاری اور فساد و نفرت جیسی باطنی غلاظتوں سے پاک کر کے اس میں شکر، تواضع، اخلاص، خیر، صلاح، خوف، رضا اور تقویٰ و طہارت جیسی خوبیوں کے پھول کھلاتا ہے۔ قرآنی فلسفۂ حیات میں تزکیہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سورۃ الشمس میں کائنات کی مختلف نشانیوں کی مسلسل گیارہ قسمیں کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانی کام یابی کو کسی معاشی یا مادی پیمانے سے نہیں بلکہ تزکیۂ نفس سے مشروط کیا، اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ یقیناً مراد پا گیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، اور نامراد رہا وہ جس نے اسے گناہوں میں چھپا دیا۔ جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا(سورۃ الشمس۔ آیت:10)۔ ترجمہ: بیشک مراد کو پہنچا جس نے اُسے ستھرا کیا

۔اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔(کنزالایمان)

یہ قرآنی اسلوب بتاتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام ایک طرف اور انسان کے باطن کی طہارت ایک طرف ہے۔یعنی نفس کو برائیوں سے پاک کرنا(تزکیۂ نفس) کام یابی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کو گناہوں میں چھپا دینا ناکامی کا سبب ہے۔

تعلیماتِ نبوی ﷺ میں تزکیے کا طریقہ کار دیگر قدیم روحانی سلسلوں اور مذاہب سے یکسر مختلف اور بے حد منفرد ہے۔ قدیم فلسفوں میں نفس کو مارنا یا دنیا سے کٹ کر جنگلوں اور غاروں میں بیٹھ جانا روحانیت کی معراج سمجھی جاتی تھی، مگر نبی اکرم ﷺ نے اس رہبانیت کو مسترد کر دیا۔ اسوۂ نبوی میں تزکیہ سماج سے کٹ کر نہیں بلکہ سماج کے اندر رہ کر انجام پاتا ہے۔ایک مسلمان بازار میں تجارت کرتے ہوئے، خاندان کے معاملات میں مصروف رہتے ہوئے اور میدانِ جنگ میں شمشیر زنی کرتے ہوئے بھی اپنے نفس کے تزکیے کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔

آپ ﷺ نے تزکیۂ نفس کی بنیادی چیز کو اس طرح بیان فرمایا:

"اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً فَاِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ"۔(صحیح البخاری)

بے شک انسان کے جسم کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہے تو سارا جسم صحیح ہے اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سن لو! وہ دِل ہے-"(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فصل من استبرأ لدینہ، ج:1، ص:13، ط: مجلس البرکات)۔

یہ حدیثِ مبارکہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ انسانی اعمال کا سارا کنٹرول اس کے باطن میں ہے، اور جب تک یہ باطن مصفیٰ و مزکیٰ نہ ہو، ظاہری اعمال مقبول خداوندی کی سعادت و شرف اور فلاح دارین کی نورانیت و تابندگی نہیں پاسکتے ہیں۔یعنی اعمال و عبادات میں صلاح و فلاح کا بنیادی ذریعہ قلب و باطن کے تصفیہ و تزکیہ میں ہے۔

جدید دور کی نفسیات نے جب انسان کے داخلی رویوں کا مطالعہ شروع کیا تو اس نے سیلف ایکچوئلائزیشن (Self-Actualization) یعنی ذات کی تکمیل کا تصور پیش کیا، جس کا محور عموماً انا کی تسکین اور انفرادی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔ مگر تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں تزکیہ "انا" کو فربہ کرنے کا نہیں بلکہ اسے رضائے الٰہی کے تابع کرنے کا نام ہے۔ اس عمل کے دو بڑے مراحل ہیں جنھیں علمائے اخلاق "تخلیہ" اور "تحلیہ" کہتے ہیں۔ تخلیہ دل کو غیر اللہ اور بری صفات سے خالی کرنے کا نام ہے، اور تحلیہ اسے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے آراستہ کرنے کا عمل ہے۔ جب کوئی انسان اس نبوی بھٹی سے کندن بن کر نکلتا ہے تو وہ محض ایک فرد نہیں رہتا بلکہ معاشرے کے لیے ایک تناور سایہ دار درخت بن جاتا ہے۔ اس کا غصہ، اس کی محبت، اس کی دوستی اور اس کی دشمنی، سب کچھ ذات کے تنگ خول سے نکل کر دینی و اخلاقی اصولوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع ہو جاتے ہیں۔

آج کا انسان، جو مادی ترقی کی انتہائیوں کو چھو لینے کے باوجود شدید داخلی تنہائی، ڈپریشن اور عدم تحفظ و سکون کا شکار ہے، دراصل اسی تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب سے محرومی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ ہم نے اپنے خاکی وجود کو سنوارنے کے لیے تو طب، سرجری اور کاسمیٹکس کے حیرت انگیز علوم ایجاد کر لیے، مگر اس وجود کے اندر دھڑکنے والے قلب میں انوار الٰہی، تجلیات ربانی اور روحانی و عرفانی نور لانے کے طریقوں کو چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں باہر سے روشن نظر آنے والا انسان اندر سے کھنڈر بن گیا۔ تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں تزکیۂ نفس وہ واحد راستہ ہے جو انسان کی اس بکھری ہوئی داخلی کائنات کو دوبارہ ترتیب دے سکتا ہے۔ یہ وہ باطنی قطب نما ہے جو قدم قدم پر بھٹکنے والے انسان کو اس کے اصل مرکز کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور اسے یاد دلاتا ہے کہ اس کی اصل معراج محض جسم کو پالنا نہیں بلکہ اپنی روح کو اس مقام تک پہنچانا ہے جہاں اسے اپنے خالق سے نفسِ مطمئنہ کا خطاب مل سکے، اور تجلیاتِ الٰہیہ سے اپنے باطنی احوال کو منور و مزکیٰ کر کے دارین کی سعادت و کام یابی حاصل کر سکے۔

رب کائنات جل جلالہ اپنے فضل وکرم سے اور اپنے حبیب رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے صدقے میں ہم سب کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب جیسی عظیم نعمتوں سے آراستہ فرمائے اور مسلک و مذہب کی خدمات بحسن و خوبی انجام دینے کے توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

از: مفتی محمد انور عالم مصباحی
استاذ و مفتی دارالعلوم غریب نواز، مرزاغالب روڈ، الہ آباد۔ یوپی۔

زندگی کا تین حصہ !!!

بخدمتِ جناب مدیر اعلیٰ صاحب، ماہنامہ اشرفیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بڑھاپا تو آخر بڑھاپا ہے، یہ زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا۔ بچپن، جوانی اور پھر بڑھاپا، یہ زندگی کے قدرتی مراحل ہیں۔ انسان چاہے کتنا ہی طاقتور، مالدار یا مشہور کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک دن اسے بڑھاپے کی منزل پر پہنچنا ہی پڑتا ہے۔ بڑھاپے میں انسان کی جسمانی طاقت کم ہونے لگتی ہے، نظر اور سماعت کمزور ہو جاتی ہے، اور چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ وہ کام جو جوانی میں آسان معلوم ہوتے تھے، بڑھاپے میں مشکل محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بڑھاپا صبر، حوصلے اور دوسروں کے تعاون کا زمانہ ہے۔

اسلام نے بزرگوں کی عزت و تکریم پر بہت زور دیا ہے۔ والدین اور تمام بزرگ افراد کے ساتھ حسنِ سلوک، احترام اور محبت سے پیش آنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ ان کی خدمت کرنا نہ صرف ایک اخلاقی فریضہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے بزرگوں کی قدر کریں، ان کی ضروریات کا خیال رکھیں، ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور انھیں کبھی تنہا یا بے سہارا محسوس نہ ہونے دیں۔

60 سال کے بعد انسان زندہ تو رہتا ہے مگر آہستہ آہستہ دنیا اس کے بغیر جینا سیکھ لیتی ہے زندگی کا سب سے خاموش مرحلہ بڑھاپا نہیں ہوتا بلکہ وہ احساس ہوتا ہے جب انسان کو یہ سمجھ آنے لگتا ہے کہ اب اس کی ضرورت پہلے جیسی نہیں رہی،، ایک وقت تھا کہ گھر آپ کے بغیر نہیں چلتا تھا لوگ آپ کے مشورے کے بغیر فیصلہ نہیں کرتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ سب اپنے اپنے راستوں پر نکل جاتے ہیں بچے اپنی دنیا میں اور دوست اپنی بیماری میں اور جن لوگوں کے لیے آپ نے پوری زندگی کھپا دی وہ بھی اپنی اپنی دنیا میں مصروف ہو جاتے ہیں، اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں پھر ایک دن انسان اپنے ہی گھر میں مہمان جیسا محسوس کرنے لگتا ہے، اور سب سے تکلیف دہ لمحہ جانتے ہیں کون سا ہوتا ہے جب انسان بول تو رہا ہو لیکن کوئی بھی پوری توجہ سے اسے سن نہ رہا ہو 60 سال کے بعد شور کم ہو جاتا ہے اور خاموشیاں لمبی ہو جاتی ہیں جسم بھی ساتھ دینا چھوڑ دیتا ہے سیڑھیاں اونچی لگنے لگتی ہیں دوائیں کھانا کھانے سے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے بڑھاپا اچانک نہیں آتا وہ آہستہ آہستہ انسان سے سب کچھ لے جاتا ہے اور انسان پہلی بار سمجھتا ہے کہ یار اصل دولت تو صحت تھی پھر ایک وقت اتا ہے کہ جب انسان کو اپنے ہی ہاتھوں کی طاقت کم ہوتی محسوس ہوتی ہے اور وہی انسان جس نے دوسروں کو ہمیشہ سہارا دیا ہوتا ہے ایک دن خود سہارے ڈھونڈ رہا ہوتا ہے اسی لیے 60 سال کے بعد زندگی سے لڑنا چھوڑ کر اپنے دل کو اللہ تعالی کے قریب لے جائیں کیونکہ آخر میں نہ شہرت ساتھ جاتی ہے نہ دولت نہ اولاد نہ ہی لوگ، آخر میں صرف دو چیزیں ساتھ رہتی ہیں ایک انسان کے اعمال اور دوسرا اس کا سکون۔

حقیقت اگر آج سمجھ لیں گے تو شاید بڑھاپا امن سے گزرے نہیں تو پھر بڑھاپا تو بڑھاپا ہے، ہاتھوں میں لاٹھی ہوگی لیکن کسی کو مارنے کے لئے نہیں بلکہ خود کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم سنبھالنے کے لئے، ڈگمگاتے ہوئے بدن کو سنبھالنے کے لئے اس۔

از: جاوید بھارتی
javedbharti508@gmail.com

سرگرمیاں

خیــروخــبر

محفل ایصال ثواب

مرغیاچک میں مفتی سراج احمد قادری مصباحی کے والد محترم، مرحوم جناب محمد عبدالحلیم راعین کے چہارم کے موقع پر ایک پروقار محفل ایصال ثواب کا انعقاد کیا گیا، جو نہایت روحانی، باوقار اور ایمان افروز ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔

اس محفل میں دارالعلوم قادریہ غوثیہ کے اساتذۂ کرام، طلبہ اور شعرا حضرات اور مرغیاچک و اطراف کے عوام و خواص کی کثیر تعداد نے شرکت کر کے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت، ایصال ثواب اور اہل خانہ سے اظہار تعزیت و ہمدردی کیا۔

محفل کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت و منقبت سے ہوا۔ شعرائے کرام اور مداحان رسول ﷺ نے اپنے پُرسوز کلام کے ذریعے سامعین کے دلوں کو عشق رسول ﷺ اور محبت اہل بیت و اولیاء سے منور کیا۔ اس کے بعد دارالعلوم قادریہ غوثیہ کے معزز اساتذہ مفتی نیاز صاحب اور مولانا غلام مذکر نے موت کی حقیقت، آخرت کی تیاری اور انسان کی ذمہ داریوں پر نہایت مؤثر اور سبق آموز گفتگو فرمائی۔ بعد ازاں مفتی رضاء الدین صاحب نے زندگی اور موت کے فلسفے کو قرآن و سنت کی روشنی میں انتہائی دلنشیں انداز میں بیان کرتے ہوئے حاضرین کو اعمال صالحہ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔

حافظ و قاری محمد معراج مرکزی نے اپنے خطاب میں قرآن و حدیث کے حوالے سے موت کی ناگزیریت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کا ہر انسان ایک دن موت کا جام نوش کرے گا، اس لیے ہر شخص کو اپنی آخرت کی تیاری میں مصروف رہنا چاہیے۔

اس کے بعد مفتی سراج احمد قادری مصباحی نے فکر انگیز خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ایصال ثواب امت محمدیہ ﷺ کے عظیم امتیازات میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ خصوصی سعادت عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کا ثواب اپنے مرحومین کو پہنچا سکتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس پر بے شمار اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ امت محمدیہ امت مرحومہ ہے، جس پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

اختتامی خطاب میں پیر طریقت، قاضی شہر سیتامڑھی، حضرت مولانا محمد اسلم القادری، پرنسپل دارالعلوم قادریہ غوثیہ مرغیا چک نے نہایت مختصر مگر انتہائی مؤثر نصیحتیں فرمائیں، مرحوم کے لیے بلندیٔ درجات، مغفرت اور اہل خانہ کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ اس کے بعد صلاۃ و سلام پیش کیا گیا اور قاضی شہر سیتامڑھی صاحب قبلہ کی رقت آمیز اور جامع دعا پر یہ نورانی و روحانی محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

اس موقع پر مولانا محمد طیب عالم نوری (ناظم اعلیٰ دارالعلوم قادریہ غوثیہ)، مولانا محمد جمیل اختر مصباحی، حافظ و قاری ولی الرحمن، مولانا مفتی سرفراز عالم، حافظ و قاری اعجاز احمد نظامی، مولانا شہباز صاحب، حافظ و قاری محمد شاہنواز، مولانا محمد افتخار عالم، مولانا محمد اعجاز احمد سمیت دارالعلوم قادریہ غوثیہ کے جملہ اساتذۂ کرام، طلبۂ علم، معزز شخصیات، اہل خاندان، رشتہ داروں اور عوام و خواص کی کثیر تعداد شریک محفل رہی۔

محفل کے اختتام پر والد محترم مرحوم محمد عبدالحلیم راعین صاحب کے ایصال ثواب کے لیے خصوصی دعا کی گئی اور اللہ تعالیٰ سے ان کی کامل مغفرت، بلندیٔ درجات اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمانے کی التجا کی گئی۔

مفتی سراج احمد قادری مصباحی، ممبئی، انڈیا
5 جولائی 2026

R.N.I. No. 29292/76
Regd. No. AZM/N.P.28 2023-25
THE ASHRAFIA MONTHLY
Mubarakpur Azamgarh (U.P.) 276404 (INDIA)

(Mob. No.) 9450109981 (Mumbai Office) 022-23726122
www.aljamiatulashrafia.org
Email: info@aljamiatulashrafia.org

SEP.
2026

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کا علمی فیضان ہندوستان گیر ہی نہیں بلکہ اب عالم گیر ہوگیا ہے۔ اشرفیہ نے جس برق رفتاری سے ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اشرفیہ کے معاونین اور دیگر اہلِ خیر اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اس وقت دو سو پچاس سے زائد افراد پر مشتمل ایک متحرک اور فعال اسٹاف اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے اور مختلف شعبوں میں تقریباً گیارہ ہزار طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بیرونی طلبہ کی خوراک، رہائش اور اساتذہ و ملازمین کی تنخواہوں پر ایک خطیر رقم سالانہ خرچ کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ادارہ بجا طور پر اہلِ خیر حضرات کی خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ والسلام

عبدالحفیظ عفی عنہ
سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

DONATION

You can make donation by cheque, Draft or by online in the favour of-

(For Education) برائے تعلیمی چندہ	(For Construction) برائے تعمیری چندہ
(1) Darul Uloom Ahle Sunnat Madrasa Ashrafia Misbahul Uloom **Central Bank of India** **A/C 3610796165** IFSC. Code: CBIN 0284532	(1) Aljamiatul Ashrafia **Central Bank of India** **A/c 3610803301** IFSC. Code: CBIN 0284532
(2) Darul Uloom Ahle Sunnat Madrasa Ashrafia Misbahul Uloom **Union Bank of India** **A/C 303001010333366** IFSC. Code: UBIN 0530301 Branch Code: 530301	(2) Aljamiatul Ashrafia **Union Bank of India** **A/c 303002010021744** IFSC. Code: UBIN 0530301 Branch Code: 530301
(3) Darul Uloom Ahle Sunnat Madrasa Ashrafia Misbahul Uloom **Punjab National Bank** **A/c 05752010021920** IFSC. Code : PUNB0057510	(3) Aljamiatul Ashrafia **Punjab National Bank** **A/c 05752010021910** IFSC. Code : PUNB0057510

(1)- Exempted u/s 80G, (5) (VI), of Income Tax Act. 1961, Vide File No. Aa.Ayukt/Gkp/80G, Redg. S.No. 178/2011-12 Dt. 30/8/2011 w.e.f A.Y 2012-13 (F.Y.2011-12)
(2)- Exempted u/s 12A, Vide Letter No. 177/2011-12

BHIM
BHARAT INTERFACE FOR MONEY

BHIM UPI Payments Accepted at
Darul Uloom Ahle Sunnat
Madrasa Ashrafia Misbahul Uloom
Account Number : 3610796165, IFSC Code: CBIN0284532

SCAN & PAY ANY UPI SUPPORTED APPS

Only for Foreign Countries. FCRA Registration. No.236250051 Nature: Educational Social. For Account Detail, please visit http://aljamiatulashrafia.in/donation.php?lang=EN